مُحدِّث

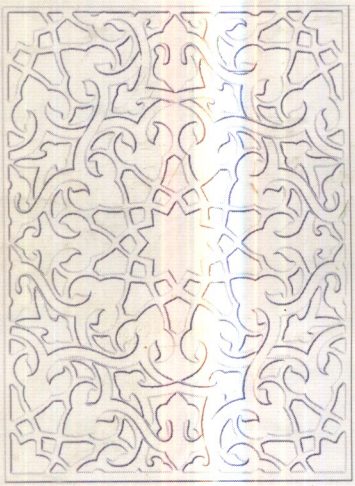

مدیر اعلیٰ

حافظ عبد الرحمٰن مدنی

مجلس التحقیق الاسلامی

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL
LAHORE - PAKISTAN

ملت اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلہ

ماہنامہ **مُحدِّث** لاہور

جلد ۳۱ عدد ۸
ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
اگست ۱۹۹۹ء

فکر و نظر

المیۂ کارگل کا اِسلامی حل — حافظ صلاح الدین یوسف — ۲

کتاب و حکمت

فہم قرآن کے بنیادی اُصول — مفتی محمد عبدہٗ الفلاحؒ — ۹

دارُ الإفتاء

تسبیح پھیرنا، ذکر میں گنتی متعین کرنا، مسئلہ وراثت — حافظ ثناءُ اللہ مدنی — ۲۶

تحقیق و تنقید

سانحہ کربلا میں اِفراط و تفریط (تسامحات) — ارشادُ الحق اثری — ۳۱

جہاد و قِتال

رسالہ "ترغیب الجہاد" — مولوی خرم علی بلہوریؒ — ۳۶

اسلام اور سائنس

کمپیوٹر اور علم و تحقیق کے بدلتے رجحانات — حافظ حسن مدنی — ۴۹

یادِ رفتگان

شیخ الحدیث محمد عبدہٗ الفلاحؒ کی خود نوشت سرگزشت — اِدارہ — ۶۲

عہد ساز شخصیت

شیخ محمد ناصر الدین البانی کو شاہ فیصل ایوارڈ — وصی اللہ مدنی — ۷۰
☆ مقدمہ سود میں مدیر اعلیٰ کی وضاحت — حافظ عبدالرحمٰن مدنی — ۷۲

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمٰن مدنی

مدیر معاون
حافظ حسن مدنی

زرسالانہ 150 روپے
فی شمارہ 15 روپے

99 J, Model Town
Lahore - 54700

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

Ph: 5866476, 5866396, 8528
Email: lics99@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر و نظر

حافظ صلاح الدین یوسف

المیۂ کارگل اور اس کا اسلامی حل

کشمیر کا مسئلہ نیا نہیں، بلکہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جن اُصولوں پر متحدہ ہند کی تقسیم عمل میں آئی تھی، ان میں ایک اُصول یہ بھی تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ لیکن اس وقت کشمیر میں ڈوگرہ راج نے اس اصول کے برخلاف بھارت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اسے پاکستان میں شامل نہیں ہونے دیا۔ اس وقت سے آج تک پاکستان کا بننے والا یہ حصہ ایک متنازعہ صورت میں قائم چلا آرہا ہے۔

اس مسئلے پر تین جنگیں بھی ہو چکی ہیں لیکن یہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو قابض ملک بھارت کا وہ رویہ ہے جو عدل و انصاف کے مسلمہ اُصولوں اور بین الاقوامی ضابطوں کے سراسر خلاف ہے۔ دوسرے، استعماری ملکوں کے مفادات ہیں جو اس وقت قوت کے نشے میں مخمور دنیا کے چودھری بنے ہوئے ہیں، وہ اس کے حل میں رکاوٹ ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ مسئلہ پاکستان کی خواہش کے مطابق حل ہو۔ تیسرے، بھارت جو نسبتاً پاکستان سے بڑا ملک ہے اور کافر ہے، بین الاقوامی طاقتیں اسے ناراض کرنا پسند نہیں کرتیں، بلکہ اس کی ناز برداری میں لگی رہتی ہیں۔ چوتھے، خود پاکستانی حکمرانوں کا رویہ بھی اس میں رکاوٹ چلا آرہا ہے، جس کی مختصر تفصیل حسبِ ذیل ہے :

ہمارے پاکستانی حکمران بدقسمتی سے جہاد کی اہمیت اور جذبے سے عاری ہی رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اس مسئلے پر پہلی مرتبہ جنگ ہوئی۔ پاکستانی فوج کے ساتھ مجاہدین نے بھی دادِ شجاعت دی اور وہ سرینگر کے قریب پہنچنے والے تھے کہ بھارتی وزیراعظم نہرو نے سلامتی کونسل کے ذریعے سے جنگ بندی کروا دی اور اس وقت اس نے وعدہ کیا کہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیا جائے گا اور وہ اپنا فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ لیکن بعد میں وہ اس وعدے سے مکر گیا اور آج تک یہ وعدہ تشنۂ تکمیل ہے۔ دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں پھر کشمیر میں جہادی تحریکیں شروع ہوئیں، جس کا مطلب بھارت کو استصوابِ رائے پر مجبور کرنا تھا۔ لیکن بھارت بجائے اس کے کہ اپنا وہ وعدہ پورا کرتا، اس نے رات کی تاریکی میں پاکستان پر حملہ کر دیا اور ۱۷ روز تک یہ پاک بھارت جنگ بھرپور انداز سے جاری رہی اور اس میں وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ تاہم اس کا ایک یہ فائدہ اسے ضرور حاصل ہوا کہ کشمیر کی تحریکِ حریت پھر دب

گئی۔ تیسری جنگ ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ اس دفعہ اگرچہ براہِ راست اس کا باعث مسئلہ کشمیر نہ تھا، تاہم پس منظر میں اس کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۶۵ء میں ایوب خاں کی اور ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خان کی حکمرانی تھی۔ ان دونوں حکمرانوں نے بھی جہاد کو کوئی اہمیت نہ دی، جس کی وجہ سے جنگ کے باوجود قضیۂ کشمیر وہیں کا وہیں رہا۔ بلکہ ۱۹۷۲ء میں بھٹو صاحب نے شملہ معاہدہ کر کے کشمیریوں کی زنجیر غلامی کو اور کس دیا اور شعلۂ جہاد کو سرد کر دیا۔ پھر جب افغانستان میں جہاد کا معرکہ سرگرم ہوا، اور وہاں اللہ نے جہادی قوتوں کو کامیابی سے ہمکنار اور روس جیسی سپر پاور کو شکست سے دوچار کیا، تو اس کے نتیجے میں ایک مرتبہ پھر کشمیریوں نے انگڑائی لی، جہاد کا شعلۂ مستور پھر بھڑکا اور خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریاں پھر شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اور یوں ۱۹۸۹ء میں کشمیر میں پھر جہاد کا آغاز ہو گیا۔ پاکستان نے بھی ہمیشہ کی طرح، اس دفعہ بھی اسے اَخلاقی امداد بہم پہنچائی، جو اس کا فریضہ بلکہ فریضے کا ایک حصہ تھا، کیونکہ پاکستان کا اصل فریضہ تو کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلوا کر اُنہیں پاکستان سے الحاق کا موقعہ فراہم کرنا تھا۔ اس کے لئے اسے کشمیریوں کو صرف اخلاقی امداد ہی مہیا کر دینا کافی نہیں، بلکہ انہیں مادی اور عسکری امداد بھی فراہم کرنا ضروری ہے اور پاکستان کا ایسا کرنا ہرگز کشمیر میں مداخلت نہیں ہے، بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی ہے۔ کیونکہ کشمیر بھارت کا حصہ نہیں، بلکہ اُصولی طور پر پاکستان کا حصہ ہے اور کشمیری پاکستانیوں کے بھائی ہیں، نسلی اعتبار سے بھی اور اسلامی و مذہبی نقطۂ نظر سے بھی۔ اس لئے پاکستان کا ان کی حمایت میں لڑنا اور ان کی تحریکِ جہاد کو تقویت پہنچانا ضروری اور اس سے اعراض و تغافل، اپنے فرض میں کوتاہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ اس جہاد میں پاکستان کی جہادی تنظیموں نے بھی بھرپور حصہ لیا اور پاکستانی فوج نے بھی اپنے مخصوص دائرے میں اُس سے خوب تعاون کیا۔ بنابریں بھارت کی ۷ لاکھ فوج بھی کشمیریوں کے جذبۂ حریت کو کچلنے میں ناکام رہی، بلکہ بھارتی فوجوں کی مزاحمت اور ان کا ظلم و ستم مجاہدین کے جذبہ جہاد کو فزوں تر کرتا اور اس شعلۂ مستور کو ہوا دیتا رہا

ع بڑھتا ہے ذوقِ جرم یاں ہر سزا کے بعد

پاک فوج اور مجاہدین کے باہم تعاون کا نقطۂ عروج کارگل اور دراس وغیرہ کی چوٹیوں پر قبضہ تھا یہ سارا علاقہ اصل میں تو پاکستانی تھا جو ۱۹۴۸ء کے جہاد میں حاصل کیا گیا تھا، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اسے بھارت نے ہتھیا لیا تھا، پھر شملہ معاہدے نے بھارتی قبضے کو اور مضبوط کر دیا۔ اس جہاد میں، جو دس سال سے جاری ہے، یہ علاقہ پاک فوج کی حکمتِ عملی اور مجاہدین کی ہمت و جرأت سے دوبارہ پاکستان کے قبضے میں آگیا۔ کارگل اور دراس و بٹالک وغیرہ کی یہ چوٹیاں کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

اولاً، یہ پاکستانی علاقہ ہے، بھارتی نہیں (جیسا کہ وضاحت کی گئی) اس لئے پاکستان کا اس پر قبضہ کر

لینا، اپنی حدود سے تجاوز نہ تھا، بلکہ اپنے علاقے کا واگزار کرانا اور کھوئے ہوئے حصے کی بازیافت تھا۔

ثانیاً، یہ اس جہاد کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا، جو دس سال سے جاری ہے، جس کی بنیاد یہ ہے کہ یہ کشمیر کا سارا علاقہ کشمیریوں کا ہے۔ بھارت کی حیثیت ایک غاصب اور قابض ملک کی ہے، ایک غاصب سے مالکوں اور حق داروں کا غصب شدہ چیز کو حاصل کر لینا مداخلت کاری نہیں بلکہ اپنے حق کی وصولی ہے۔ کشمیری جہاد کے ذریعے سے جتنا بھی علاقہ ایک غاصب فوج سے چھین لیں، یہ ان کا جائز اور قانونی حق ہے۔

ثالثاً، کنٹرول لائن مسلمہ بین الاقوامی سرحد نہیں کہ اسے تقدس کا درجہ حاصل ہو۔ بلکہ یہ ایک عارضی انتظام اور حل تھا کہ جنگ بندی کے وقت جو جہاں ہے وہیں رہے، اس سے آگے نہ بڑھے۔ لیکن کب تک؟ ہمیشہ کے لئے؟ نہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں۔ کیونکہ عارضی انتظام دائمی نہیں ہوتا بلکہ محدود اور مؤقت ہوتا ہے۔ یہ عارضی انتظام ایک وعدے کا مظہر ہے اور وہ ہے سلامتی کونسل کی نگرانی میں استصوابِ رائے کے انعقاد کا۔ یعنی بھارت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیریوں کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دے گا کہ وہ پاکستان کے ساتھ اِلحاق چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ؟ پاکستان اور کشمیری عوام نے جو فریق دوم ہے اس وعدے پر اعتبار کر کے 'سٹیٹس کو' کو تسلیم کیا تھا اور سلامتی کونسل ایک ضامن اور ثالث کی حیثیت سے تیسرا فریق تھا۔ جب فریق اول اور فریق ثالث اپنا وعدہ پورا کرنے اور کرانے پر آمادہ نہ ہوں، تو فریق دوم کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایسی کارروائی کرے کہ جس سے مذکورہ دونوں فریق اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس عارضی انتظام کی بجائے مستقل بنیادوں پر اسے حل کریں۔ کارگل کی چوٹیوں کو سر کرنے میں یہی مقصد کارفرما تھا کہ دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کی جائے تاکہ وہ بھارت کو اسکی ہٹ دھرمی سے ہٹا کر حق وانصاف کے مطابق اس مسئلے کو حل کرنے پر آمادہ کرے

رابعاً، یہ چوٹیاں اپنی بلندیوں کی وجہ سے مذکورہ مقصد کے حصول کے لئے بڑی مفید تھیں کیونکہ سیاچین کا وہ پاکستانی علاقہ جس پر بھارت نے ۱۹۸۴ء میں قبضہ کیا تھا اور اب وہاں اس کی پچاس ساٹھ ہزار فوج مستقل طور پر موجود ہے، اس تک پہنچنے کا واحد راستہ وہی ہے جو ان پہاڑوں کے دامنوں اور وادیوں سے گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان بلند چوٹیوں پر موجود مجاہدین کے خلاف بھارت کوئی کامیاب کارروائی بھی نہیں کر سکتا، جیسا کہ مجاہدین کے دوماہ کے قبضے سے بھارت کی یہ ناکامی واضح ہو کر سامنے آئی۔ بھارت نے زمینی اور فضائی دونوں قسم کی جنگی کارروائیوں کے ذریعے سے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ مجاہدین پر کوئی ایسی کاری ضرب لگائے کہ وہاں سے مجاہدین کا قبضہ ختم ہو جائے، لیکن وہ اس میں سخت ناکام رہا۔ اس اعتبار سے مجاہدین کے لئے یہ ایک نہایت محفوظ مقام اور حکمتِ عملی کے اعتبار سے ایک مؤثر ہتھیار تھا۔ وہ سیاچین کو جانے والی ہر رسد اور کمک کو آسانی سے نشانہ بنا سکتے تھے اور یوں کچھ عرصے

تک بھارت کا سیاچین تک پہنچنے کا واحد راستہ مسدود کر کے وہ ہزاروں بھارتی فوجیوں کو موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا کر کے غاصب و ظالم بھارت سے اپنے بعض جائز مطالبات منوانے یا بھارت کو حق و انصاف کا اہتمام کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

خامساً، مجاہدین کی اس کارروائی سے دنیا کے سامنے واضح ہو گیا کہ بھارتی افواج اپنی کثرت کے باوجود پاکستانی فوج اور مجاہدین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس کا گھمنڈ خاک میں مل گیا، اس کی بڑائی کا بت پاش پاش ہو گیا اور جنوبی ایشیا میں اس کی بالادستی کا خواب بکھر کر رہ گیا۔ اس بنا پر بھارت کا سیکورٹی کونسل میں نشست حاصل کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔

سادساً، اس فتح و ظفر سے پاکستان کا سر افتخار سے بلند ہو گیا، مجاہدین کی دھاک بیٹھ گئی اور پاکستان کو اقوامِ دنیا میں ایک خاص عظمت و وقار کا مقام حاصل ہوا۔

غاصب و ظالم بھارت کے مقابلے میں یہ کامیابیاں اللہ کی خاص مہربانی اور اس کا فضل و کرم تھا، اب ان حاصل شدہ کامرانیوں کا تحفظ نہایت ضروری تھا تاکہ اس دشمن کے حوصلے مستقبل میں بھی پست رہیں جو نہایت عیار اور مکار ہونے کے علاوہ بین الاقوامی استعمار کا آلہ کار اور اس کا لاڈلا بھی ہے۔ اور جو نہ صرف کشمیر پر اپنا ناجائز تسلط برقرار رکھنا چاہتا ہے بلکہ پاکستان کے وجود کو بھی ختم کرنا اس کے مذموم مقاصد میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کے ۲۰، ۲۲ کروڑ مسلمان شہری بھی، جو آج تک بھارتی ظلم و جارحیت کا شکار چلے آرہے ہیں سکھ کا سانس اسی وقت لے سکتے ہیں جب پاکستان مضبوط اور ناقابل تسخیر ہو۔

گویا اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بھارت پر جو عظمت و برتری عطا فرمائی تھی، اس کا تحفظ اس لئے ضروری تھا کہ بھارت مرعوب اور خوف زدہ رہے تاکہ:

- وہ کشمیر کا مسئلہ بھی حق و انصاف کے مطابق حل کرنے پر آمادہ ہو۔
- پاکستان کے بارے میں جو مکروہ عزم وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے، اسے دل سے نکال دے اور پورے شرحِ صدر سے پاکستان کا وجود تسلیم کر کے ایک امن پسند ہمسائے کی طرح پاکستان سے معاملہ کرے۔
- بین الاقوامی طاقتوں کے بھرّے اور غرّے میں آکر بالادست بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔
- بھارتی مسلمانوں کو وہ تمام شہری حقوق دے جو ان کا مسلمہ حق ہے اور ان پر ظلم و ستم کا سلسلہ بند کر دے لیکن افسوس موجودہ حکمران بھی سابقہ حکمرانوں کی طرح ہی بزدل ثابت ہوئے اور اپنی بزدلی کی وجہ سے حاصل شدہ کامیابیوں کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کی بجائے اپنی کامیابیوں کو

ناکامی میں، عزت وافتخار کو ذلت میں اور بلندیوں کو پستی میں تبدیل کر دیا، اپنی کلاہِ عظمت کو داغ دار کر لیا اور کشمیر کے قضیے کے حل کی طرف پیش رفت کے سنہری موقعے کو نہ صرف ضائع کر دیا، بلکہ آئندہ کے لئے اس کے امکانات کو مزید مخدوش بنا دیا۔

موجودہ حکمرانوں نے اعلان واشنگٹن سے کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں..... البتہ کھو بہت کچھ دیا !!

- اپنی عظمت وفتح کھو دی۔
- دشمن پر واضح برتری کھو دی۔
- قضیۂ کشمیر کے حل کا اِمکان ضائع کر دیا۔
- پاکستان کے وجود کو خطرات سے دوچار کر دیا۔
- دشمن کے حوصلے بلند کر دیئے۔
- بھارت کے کروڑوں مسلمانوں کے حق میں پھوٹنے والی اُمید کی کرن ختم کر دی۔
- دنیا کے سامنے اپنا جارح اور مداخلت کار ہونا تسلیم کر لیا۔
- اُن مجاہدین کا اعتماد کھو دیا جنہوں نے سرفروشی اور شجاعت کی لازوال داستانیں رقم کیں۔
- پاک فوج کے ولولوں اور جذبوں کی قدر افزائی کی بجائے، ان کی ناقدری کی اور انہیں احساسِ شکست سے دوچار کر دیا۔
- اور..... طوقِ غلامی کو اور مضبوط اور اپنی بے دست پائی کو آشکارا کر دیا۔

ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ان "کامیابیوں" کو دیکھ کر..... آپ بھی شرمسار ہو، ہمیں بھی شرمسار کر !!

پس چہ باید کرد

اب ناکامی اور ذلت کا یہ تیر، جو حکمرانوں نے اعلان واشنگٹن کی صورت میں چلایا ہے، واپس تو نہیں آسکتا۔ لیکن اگر حکمران اب بھی ہوش میں آجائیں اور قرآنی فیصلے کو تسلیم کر لیں اور اس کے مطابق اپنا نصب العین متعین کر کے مناسب اقدامات بروئے کار لائیں تو مذکورہ نتائج و مضمرات کا اِزالہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ قرآنی فیصلہ یہ ہے کہ وہ اس پسپائی کو ایک وقتی حربہ سمجھ کر دشمن سے بھرپور جنگ کی تیاری کریں۔ کیونکہ حکمرانوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم یہ پسپائی اختیار نہ کرتے تو بھارت پاکستان پر حملہ کر دیتا، جب کہ ہمارے اقتصادی حالات جنگ کے متحمل نہیں تھے۔ ہمیں جنگ سے اس سے کہیں زیادہ نقصانات اُٹھانا پڑتے جو موجودہ اقدام سے ہمیں اٹھانا پڑ رہے ہیں۔ اگر حکمرانوں کی یہ بات

فی الواقع صحیح ہے تو اولاً تو پوری قوم کو اعتماد میں لے کر امریکہ جانا چاہئے تھا اور ثانیاً آئندہ کے لئے ایسی حکمتِ عملی اور پالیسی تیار کرنی چاہئے تھی جو جنگ سے گریز کی بجائے بھرپور جنگ کی تیاری کی آئینہ دار ہوتی۔ حکمرانوں نے ایک غلطی تو یہ کی کہ قوم کو اعتماد میں لئے بغیر اتنا بڑا فیصلہ از خود کر لیا، جو نص قرآنی ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (سورۃ الشوریٰ) "مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں" کے خلاف ہے۔ لیکن اب دوسرا اقدام مشاورت سے طے ہو سکتا ہے اور مشاورت سے ہی طے ہونا چاہئے۔ تاکہ اُس قرآنی وعید سے ہم بچ سکیں جو پسپائی اختیار کرنے والوں کے لئے بیان کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے خطاب کر کے فرمایا ہے :

﴿اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ﴾ (الانفال:۸/۱۶)

"اے مسلمانو! جب کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو، تو پیٹھ پھیر کر مت بھاگو، (یاد رکھو!) جو اس دن پیٹھ پھیر کر بھاگے گا تو یقیناً وہ اللہ کے غضب کا مستحق اور جہنمی ہوگا۔ تاہم پیچھے ہٹنے کی دو صورتیں جائز ہیں: لڑائی کے لئے پینترا بدلنا مقصود ہو یا اپنی جماعت کی طرف پناہ حاصل کرنا....."

یعنی جب معرکۂ کارزار گرم ہو تو اس میں حصہ لینے والے مجاہدوں اور سپاہیوں کو پیٹھ پھیر کر بھاگنے کی اور میدانِ کارزار سے پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں لڑنے والے اگر یہ محسوس کریں کہ وہ اس مقام پر یکہ و تنہا رہ گئے ہیں، اس لئے پیچھے ہٹ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں اور ان کی معیت و جمعیت کے ساتھ لڑیں یا وہ دیکھیں کہ ان کی اختیار کردہ تدبیر اور حکمت عملی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہے، اس لئے اس میں تبدیلی ناگزیر ہے، چنانچہ وہ نئی حکمت عملی یا نئی چال چلنے کے لئے پیچھے ہٹیں تو پیچھے ہٹنے کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد اصل میں راہِ فرار اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ زیادہ مفید اور مؤثر طریق کار اختیار کرنا ہوتا ہے۔

بنا بریں حکومت اگر سمجھتی ہے کہ کارگل کی وہ صورتِ حال جو اعلانِ واشنگٹن سے قبل تھی، وہ پاکستان کے لئے یا کشمیر کے کاز کے لئے مفید نہیں تھی۔ اس کی بجائے کوئی دوسرا رستہ یا طریقہ یا حکمت عملی اختیار کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگی اور اس عارضی پسپائی اور واپسی میں ملک و ملت کا مفاد مضمر ہے، تو حکومت کو اولاً تو دلائل سے اپنا یہ نقطۂ نظر ثابت کرنا چاہئے اور پھر نئی حکمتِ عملی کے خطوط واضح کر کے اس کے لئے مؤثر اقدامات کا آغاز ہونا چاہئے۔ یہی وہ موقف اور طریقہ ہے جسے اختیار کر کے حکومت عوام کے غیظ و غضب سے بھی بچ سکتی ہے اور عند اللہ بھی سرخرو ہو سکتی اور اس وعیدِ قرآنی سے محفوظ رہ سکتی ہے جو مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ حکومت کی طرف سے جیسے پہلے اقدام سے پہلو تہی کی جا رہی ہے،

دوسرے اقدام کی بابت بھی کسی اِہتمام کا کوئی اِمکان نظر نہیں آرہا ہے۔ یعنی اعلانِ واشنگٹن کے بعد وزیراعظم صاحب نے قوم سے خطاب تو فرمایا ہے لیکن کارگل کی معرکہ آرائی سے پیدا ہونے والی سنگینی اور خطرناکی کی وضاحت سے وہ ابھی تک گریزاں ہیں۔ حتی کہ قومی اسمبلی میں بھی اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اُنہوں نے محسوس نہیں کی، حالانکہ اسمبلی کا اجلاس اسی مقصد کے لئے بلایا گیا تھا اور اپوزیشن اور ارکانِ اسمبلی کا شدید مطالبہ تھا کہ میاں نواز شریف خود ان تمام حالات وواقعات کی وضاحت کریں جن کی وجہ سے انہوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ اور یکطرفہ طور پر مجاہدین کو واپس بلانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ظاہر بات ہے کہ جب وہ اپنے پہلے اقدام ہی کی وضاحت نہیں کر رہے ہیں تو ان سے دوسرے اقدام (جنگ کی بھرپور تیاری) کی امید کیوں کر کی جاسکتی ہے؟

یہ صورتِ حال یقیناً نہایت خطرناک اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اگر قوم نے بھی حکومت کی اس بزدلانہ پالیسی اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والی پسپائیت کے خلاف مؤثر احتجاج نہ کیا، تو وہ بھی عنداللہ برابر کی مجرم ٹھہرے گی۔ بنابریں ضروری ہے کہ قوم اپنے شعور اور بلوغت کا ثبوت دے اور اعلانِ واشنگٹن کے خلاف ایسا بھرپور احتجاج کرے کہ حکمران اس کو واپس لینے پر مجبور اور بھارت کے ساتھ مقابلے کا عزم کرنے پر تیار ہو جائیں۔

اس مرحلے پر قوم اور حکومت نے اگر اپنے عزم جہاد اور جذبۂ سرفروشی کا یہ کہہ کر اظہار نہ کیا:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تو یاد رکھئے کہ دشمن کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے، جس سے قضیۂ کشمیر کا حل بھی ناممکن ہو جائے گا، بھارتی مسلمانوں کا مستقبل بھی مزید تاریک ہو جائے گا اور خود پاکستان کی بقاء وسلامتی بھی خطرات سے دوچار رہے گی، اس لئے کہ:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے اَزل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وما علینا إلا البلاغ!

مدیرانِ جرائد کی خدمت میں محدث کے ذریعے ہم اُمت میں علمی ذوق کی آبیاری اور پیش آمدہ مسائل میں تحقیقی روش کی ترویج چاہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ اَمر خوش آئند ہے کہ بالخصوص چند ماہ سے ملک وبیرونِ ملک علمی ودینی جرائد میں محدث کے مطبوعہ مضامین کو دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ اطلاع دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ہر شمارہ کے ۲/۳ مضامین دیگر اخبارات ورسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہماری اپنے ان کرم فرماؤں سے گذارش ہے کہ اسلام کی درست ترجمانی کے مشن میں اس تعاون پر ہم ان کے شکر گزار ہیں لیکن انہیں اخلاقی طور پر کم ازکم "ماہنامہ محدث لاہور" کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔ اس امر کی طرف ہمارے بعض مضمون نگاروں نے بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ معاصر رسائل اس امر کا اہتمام کر کے باہمی تعاون کے نیک جذبات کو فروغ دیں گے۔ (ادارۂ محدث)

کتاب وحکمت

شیخ الحدیث مفتی محمد عبدہ الفلاح

فہم قرآن کے بنیادی اُصول☆

قرآنِ پاک نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور آنحضرت ﷺ کی صداقت پر دائمی معجزہ، اس نے اپنے نزول کے ساتھ تاریخ عالم کا دھارا بدل دیا اور پھر اپنی جامعیت اور گہرائی کے اعتبار سے ہر دور میں انسانی عقل و فکر کے لئے رہنما ہے۔ اس کی زبان معجزانہ ہے اور اندازِ بیان اچھوتا، اس کی تفسیر و تاویل، اِعجاز و اِعراب، تاریخ و جغرافیہ، اُسلوبِ بیان وغیرہ پر جس قدر لکھا جاچکا ہے وہ بھی معجزہ سے کم نہیں۔ ہر دور میں مفسرین نے اپنے خصوصی ذوق اور ماحول کے مطابق اس کی خدمت کی ہے جس سے تفسیر اور علومِ قرآنی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ دوسری صدی کے علماء کی تفاسیر پر نظر ڈالیں تو وہ صرف صحابہ و تابعین کے اقوال پر مشتمل نظر آئیں گی مگر اس کے بعد ہر دور میں علومِ تفسیر میں اضافہ ہی نظر آتا ہے حتیٰ کہ فی زمانہ یہ علوم اس قدر پھیل چکے ہیں کہ کسی ایک علم پر اِحاطہ بھی مشکل ہے اور علومِ تفسیر نے اس قدر ارتقائی شکل اختیار کرلی ہے کہ ان کا تاریخی جائزہ بھی بجائے خود ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ ان علوم کے ارتقاء اور ان کی تفصیل سے قطع نظر یہاں پر ہم صرف ان وسائل و عناصر کو موضوعِ سخن بناتے ہیں جو قرآن فہمی میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں اور جن کے ملحوظ نہ رکھنے سے قرآن فہمی مشکل ہے اور پھر ان عناصر کی تربیتی حیثیت سے صرفِ نظر کرنا بہت سی گمراہیوں اور لغزشوں کا موجب بن سکتی ہے۔

اس باب میں تتبع اور جستجو کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علمائے تفسیر نے قرآن فہمی اور تفسیر بالماثور کے سلسلہ میں عموماً چار چیزوں سے استفادہ کیا ہے اور دورِ حاضر میں بھی ان کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ہم عجمیت زدہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کا مطالعہ انہی بنیادی اُصولوں کی روشنی میں کریں تاکہ قرآن فہمی کا دشوار راستہ سہل ہو جائے۔ اب ہم ان اُصول و عناصر میں سے ہر ایک کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

قرآن کی تلاوت اور اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے بعض حقائق کو ذہن نشین کرنے کے لئے متعدد مقامات پر اُن کا اِعادہ کیا ہے لیکن ہر مقام پر اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ ایک مقام پر اگر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر اسی کو تفصیل سے بیان فرمادیا ہے اور پھر مقصد و اِستدلال کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بعض آیات میں اگر اِطلاق ہے تو دوسری آیت

☆ دارالحدیث، راجووال کے دورۂ تفسیر میں یہ مقالہ پڑھا گیا..... (۱۹۷۵ء) ترجمہ عربی عبارات: حسن مدنی

میں اسے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر اگر عموم ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے پھر اسی قسم کے اندازِ بیان کے پیش نظر قرآن نے اپنے آپ کو ﴿كِتَابًا مُتَشَابِهًا﴾ اور مَثَانِي فرمایا ہے اور اسی تکرار کو تصریفِ آیات سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے اسی پیرایہ بیان کے پیش نظر علماء نے لکھا ہے:

(ا) قرآن کی تفسیر، قرآن کے ذریعے

القرآن یفسّر بعضُه بعضًا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی وضاحت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی کے لئے یہ لازم ہے کہ اولاً خود قرآن سے ہی رہنمائی حاصل کی جائے۔ علمائے تفسیر نے اس کو اولیٰ اور بنیادی حیثیت دی ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کا سب سے بہتر طریق کیا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اولاً قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے" (مقدمہ تفسیر، ص ۳)

حافظ ابن تیمیہؒ نے متعدد مقامات پر اسی اصل پر زور دیا ہے چنانچہ فتاویٰ، ۱۳/۳۶۳ پر رقمطراز ہیں

"اصح طریق یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے تلاش کی جائے کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر اگر اِجمال ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے، اسی طرح ایک مقام پر اختصار ہے تو دوسرے مقام پر اسی مفہوم کو قدرے اِطناب (طوالت) سے ذکر فرمایا گیا ہے۔"

(i) مثلاً سورۂ مؤمن آیت ۸۲ میں ہے ﴿وَإِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ﴾

"کہ اگر یہ سچا ہے تو تمہیں وہ کچھ پہنچ کر رہے گا جس کا تم سے وعدہ کر رہا ہے"

یہاں پر بَعْضُ الَّذِيْ سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے کیونکہ اسی سورہ کے آخر میں ہے:

﴿وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ﴾ (آیت ۷۷)

"اگر ہم تمہیں وہ بعض جس کا وعدہ کرتے ہیں دنیا میں دکھلا دیں یا اس سے پہلے تمہیں فوت کر لیں تو ان لوگوں نے بہر حال ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے"

(ii) سورۃ نساء (آیت ۲۷) میں ہے:

﴿وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا﴾

"جو لوگ اپنی شہوات کے تابع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بری طرح گمراہ ہو جاؤ"

"جو لوگ" سے اہل کتاب مراد ہیں کیونکہ اسی سورہ (آیت: ۴۴) میں ہے ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ﴾

"تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب سے بہرہ ور کئے گئے کہ وہ گمراہی اختیار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ"

(iii) سورۂ بقرہ (آیت: ۳۷) میں ہے ﴿فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ﴾
"پس آدمؑ نے اپنے پروردگار سے چند کلمات لے لئے"

سورۂ اعراف (آیت: ۲۳) میں ان کلمات کی تفصیل مذکور ہے یعنی ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے جانوں پر ظلم کیا، اگر ہمارا گناہ معاف نہ ہوا اور ہم پر رحم کی نظر نہ کی تو ہم خائب و خاسر ہو جائیں گے"

(iv) اسی طرح آیت ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) کی وضاحت سورۂ قیامہ کی آیت ۲۳ ﴿إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ سے اخذ کر سکتے ہیں۔

(v) سورۃ المائدہ میں آیت ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ کی تفسیر آیت نمبر ۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ سے کر دی گئی ہے۔

(vi) مطلق و مقید کی مثال میں آیتِ وضو اور آیت تیمّم پیش کر سکتے ہیں کہ آیتِ تیمّم میں ﴿وَأَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ مطلق ہے اور آیتِ وضو میں ﴿إِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے ساتھ مقید ہے جیسا کہ اکثر شوافع کا مسلک ہے۔

(vii) اسی طرح بعض علماء کے نزدیک آیتِ ظہار میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾ آیتِ قتل میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ کے ساتھ مقید ہے۔

(viii) سورۂ بقرہ (آیت ۲۵۴) میں قیامت کے دن خِلّت یعنی دوستی کی نفی مذکور ہے۔ مگر زخرف (آیت ۶۷) ﴿اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ فرما کر مؤمنین کو مستثنیٰ کیا ہے۔

☆ تفسیر القرآن بالقرآن کے سلسلہ میں اختلافِ قراءات کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین بعض آیات کی تفسیر میں اختلافِ قراءت سے استفادہ کرتے رہے ہیں مثلاً سورۃ الاسراء (آیت: ۹۳) ﴿أَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں مِنْ ذَهَبٍ ہے جس سے لفظ زُخرف کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آیت ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ میں ایک قراءت ﴿فَامْضُوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ ہے جس سے سَعْی کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی قراءات ہیں جن سے نفس آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قراءت تو تفسیر کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

"اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوالات حضرت ابن عباسؓ سے استفسار کئے بغیر ہی حل ہو جاتے" (المذاہب الاسلامیہ فی التفسیر)

بلکہ بعض علماء نے تفسیری ارتقاء کے سلسلہ میں اختلافِ قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہ و تابعین نے اختیار کیا۔ مگر اس سلسلہ میں یہ بات

یاد رکھنے کی ہے کہ قرأتِ متواترہ تو نصوصِ قرآن کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن قراءاتِ شاذہ کو ہم تفسیری مراجع میں شمار کر سکتے ہیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر کو بطورِ مثال پیش کر سکتے ہیں جو کہ تفسیر القرآن بالقرآن کے سلسلہ میں نہایت معتمد تفسیر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ، ابن تیمیہؒ کے تلمیذِ رشید تھے اور حافظ تیمیہؒ اس طرزِ تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور پھر حافظ ابن کثیر خود بھی سلفی نقاد تھے اور سلف کے طرزِ تفسیر کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بنا پر ان کی تفسیر ایک تو سلف کے مسلک کی ترجمان نظر آتی ہے اور دوسرے، اس میں اسرائیلیات پر تنقید بھی ہے جس سے علامہ طبریؒ کی تفسیر معریٰ (عاری) نظر آتی ہے۔ ہندوستانی علمائے تفسیر میں شیخ الاسلام امرتسری وہ واحد عالم ہیں جنہوں نے تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن خالصتاً اسی طرز پر لکھی ہے۔ یہ تفسیر گو مختصر ہے لیکن موصوف کی یہ کوشش (اس حوالے سے) قابل قدر ہے۔

(۲) قرآن کی تفسیر، حدیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

قرآن فہمی کے سلسلہ میں سنتِ نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے بلکہ آئمہ نے سنتِ نبوی ﷺ کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ آیت ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ (النحل ۴۴) میں قرآن کی تبیین کو اہم ترین فریضہ رسالت بتلایا گیا ہے۔ اس بنا پر علمائے اسلام نے سنتِ نبویؐ کی تدوین میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کی حجیت سے انکار دراصل تفسیر بالرائے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لئے اس کو لازم قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ الرسالۃ (رقم ۳۰۳) میں لکھتے ہیں:

"آنحضرتؐ نے جو بھی فیصلہ صادر فرمایا ہے، وہ قرآن سے سمجھ کر ہی صادر فرمایا ہے"

اس بنا پر علماء نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ قرآن فہمی پر بحث کے دوران لکھتے ہیں: (فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۱۳ ص ۳۶۳، ۳۶۴)

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے، اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا: ألا إني أوتيت القرآن ومثله معهٗ يعني السنة" اور سنت بھی وحی ہے جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ ائمہ نے اس پر دلائل پیش کئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سنت کو مرجع ثانی کی حیثیت دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے" (مقدمہ تفسیر، ص ۳)

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں، ان کی تفسیر و توضیح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے..... ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک قرآن میں اَحکام کا تعلق ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں لہٰذا تفسیر قرآن کے اس حصہ کے لئے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے" (ص ۳۳)

دو اعتراض اور ان کے جوابات

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں ضعیف روایات کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: "ثلاثة ليس لها أصل: التفسير والملاحم والمغازي" کہ تین قسم کی کتابیں بے اصل روایات پر مشتمل ہیں۔ یعنی تفسیر ملاحم اور مغازی۔ تو پھر تفسیر بالحدیث پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے جبکہ ان سے اِستناد ہی جائز نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ساری روایات مراد نہیں ہے بلکہ احمد بن حنبلؒ کے پیش نظر خاص قسم کی کتابیں ہیں جن کی وہ تردید کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں: "وأما كتب التفسير فمن أشهرها كتابا الكلبي و مقاتل بن سليمان وقد قال أحمدؒ في تفسير الكلبي من أوله الى آخره كذب"

پھر اگر ہر قسم کی تفسیری روایات امام احمدؒ کے نزدیک غیر مستند ہوتیں تو امام موصوف اس تفسیری صحیفہ کی تحسین نہ فرماتے جو کہ علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں بلکہ امام نے اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے (الفوز الکبیر) چنانچہ امام بخاریؒ اپنی تفسیر میں اسی صحیفہ پر اعتماد کرتے نظر آتے ہیں۔

☆ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تفسیر مرفوع بلاشبہ حجت ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "لم يكن النبي ﷺ يفسر شيئا من القرآن إلا آيات تُعَدُّ علّمهن النبي ﷺ إياه جبريل" یعنی "نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی صرف گنتی کی چند آیات کی تفسیر کی ہے، جن کی تفسیر جبرئیلؑ نے آپ کو سکھلائی تھی"

اس طرح امام سیوطیؒ اس موضوع پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"الذي صح من ذلك قليل جدا بل أصل المرفوع منه في غاية القلة" یعنی "حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے"..... اس لئے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت قرار دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث پیش کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ مرفوع حدیث کی قلت کا دعویٰ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے پورے

قرآن کی تلاوت فرمائی ہے، اسی طرح قرآن کے معانی و مطالب بھی بیان کئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ سورۂ نحل آیت ۴۴ میں قرآن کی تبیین کو آنحضرتؐ کے فرائض میں رکھا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتبع دوسرے علماء نے دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے جن میں سے ہم بعض کی طرف بالاختصار اشارہ کرتے ہیں:

(۱) ابو عبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی، ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ کا بیان ہے کہ جب ہم آنحضرتؐ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک اس کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملاً اپنا نہ لیتے، ان سے آگے نہ بڑھتے۔ چنانچہ صحابہؓ کا بیان ہے: "فتعلّمنا القرآنَ والعلم والعمل جميعا" "ہم نے قرآن کا علم اور اس پر عمل کرنا بیک وقت سیکھا"..... یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے" اور حضرت عمرؓ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی اور ظاہر ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اسکے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

حافظ ابن تیمیہؒ فتاویٰ میں مزید وضاحت کے طور پر لکھتے ہیں:

> "اور اس بات کو ہم عادتاً باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کوئی شخص مثلاً طب یا حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر سمجھنے کے پڑھنا (آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہو سکتا ہے) مگر صحابہ کرامؓ سے اس کا تصور بھی بعید ہے خصوصاً جبکہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق حاصل کرنے پر بھی حریص رہتے تھے" (فتاویٰ، ج ۱۳، ص ۳۳۱ تا ۳۳۳)

بحث روایتِ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ

پھر جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں، ان کا حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اولاً تو حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہیں جس پر امام بخاریؒ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبریؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں: "إنه ممّن لا يعرف في أهل الآثار" یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو اہل روایت میں سے کوئی نہیں جانتا۔

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرطِ صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہؓ کے اس بیان کا تعلق قرآن کی تفسیر کے اس حصہ سے ہے جو غیبی اُمور سے متعلق ہے۔ مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیتِ الٰہی کے خلاف تھا جیسا کہ

آنحضرت ﷺ نے جبریلؑ کے جواب میں "ما المسئول عنها بأعلم من السائل" (جس سے پوچھا جارہا ہے، وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا) کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔

نیز امام طبریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں :

"تفسیر چار قسم پر ہے، ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے تھے۔ اس نوع کے تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی..... اور چوتھی قسم وہ جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اسکا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تفسیر سے آنحضرتؐ تعرض نہ فرماتے تھے"

الغرض آنحضرت ﷺ نے قرآن کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث وسنن میں محفوظ ہے۔ اسی بنا پر علماء نے قرآن وسنت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو قرآن کا شارح تسلیم کیا ہے۔

امام اوزاعیؒ حسان بن عطیہ سے بیان کرتے ہیں :

"آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی تو پھر حضرت جبریلؑ قرآن کی تفسیر کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے"

یہی امام اوزاعیؒ، مکحول سے روایت کرتے ہیں کہ "القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى القرآن" کہ قرآن اپنی تشریحات میں جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اقوالِ صحابہؓ

اگر قرآنِ کریم کی کوئی مشکل خود قرآن اور حدیث سے حل نہ ہو رہی ہو تو اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع لازم ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ جاہلی اَدب، اہل کتاب کے عادات و اَطوار اور لغت کے اَوضاع واَسرار سے بخوبی واقف تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن اَحوال وظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اُن کی نظروں کے سامنے تھے اور وہ آیات کے پس منظر سے آگاہ تھے پھر ان کے اَذہان بھی صاف ستھرے اور گردوپیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: (مقدمہ تفسیر)

"صحابہ کرامؓ اس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا"

اس بنا پر علماء نے قرآن وسنت کے بعد اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے خصوصاً ان صحابہؓ میں سے خلفاءِ اربعہ اور اصحابِ علم وفضل کے اقوال سے بے اعتنائی ناممکن سی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ بھی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وحنيئذ إذا لم نجد التفسير في القرآن ولا في السنة رجعنا في ذلك إلى

أقوال الصحابة فإنهم أدرى بذلك لما شاهدوه من القرآن والأحوال التى اختصوا بها ومالهم من الفهم التامّ والعلم الصحيح والعمل الصالح.....الخ"

"جب ہمیں کسی آیت کی قرآن اور سنت میں تشریح نہ ملے تو ہم صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ وہ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے بایں وجہ کہ وہ نزولِ وحی کے وقت موجود تھے، اور ان حالات سے جن میں قرآن نازل ہوا، اُنہیں آگاہی تھی، علاوہ ازیں وہ مکمل فہم وفراست، صحیح علم اور نیک اعمال کی خوبیوں سے متصف تھے"

تتبع سے ثابت ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ نے مصادرِ خمسہ سے استفادہ کیا ہے: قرآن وسنتِ نبوی جن کا بیان گزر چکا ہے، علاوہ ازیں تین مآخذ حسب ذیل ہیں جن کی حیثیت پر ہم بحث کرتے ہیں :

(الف) اسبابِ نزول کی معرفت

(ب) تورات وانجیل (اسرائیلیات)

(ج) اَوضاعِ لغت اور ادبِ جاہلی

(الف) اَسبابِ نزول

بلاشبہ قرآنِ پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے۔ قرآن کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداء موعظت وعبرت یا اصولِ دین اور احکامِ تشریع کے بیان میں نازل ہوا ہے لیکن قرآن کا کچھ حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اُترا ہے۔ علماء نے ان حوادث/سوالات کو اَسباب سے تعبیر کیا ہے (قرطبی، ص ۳۹)

اسبابِ نزول کے علم سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے اور آیت کے سبب سے جہالت بسا اوقات حیرت کا موجب بنتی ہے، اس لئے اسبابِ نزول کی معرفت کو علم تفسیر میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور علماء نے علومِ قرآن پر جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں اسبابِ نزول کے عنوان کو مستقل طور پر ذکر کیا ہے بلکہ خالصتاً اسبابِ نزول پر بھی کتابیں مرتب کی ہیں، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں:

"أفرده بالتصنيف جماعة أقدمهم علي ابن المدينى شيخ البخاري"

"علما نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تصنیف علی بن مدینی کی ہے جو امام بخاری کے شیوخ سے ہیں"

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اس سلسلہ کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد ۴۶۸ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی فيه أعواز (اس میں مشکلات ہیں) کہہ کر اس پر طنز بھی کردی ہے اور حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) کی اسبابِ نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "فات عنه مسودة فلم نقف عليه كاملا"

"انکی کتاب کا مسودہ ضائع ہوگیا جس کی وجہ سے ہم پوری طرح اس سے فیض یاب نہیں ہوسکے"

پھر امام سیوطیؒ نے خود بھی اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کے متعلق لکھتے ہیں:

وألفت فيه تأليفا موجزا لم يُولف مثله فى هذا النوع سمّيته لباب النقول فى أسباب النزول" "اس موضوع پر میری بھی ایک یگانہ روزگار تالیف ہے جس کا نام میں نے لباب النقول في أسباب النزول رکھا ہے"

بہر حال اسبابِ نزول کی اہمیت کے پیش نظر علما نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسباب کے بیان کا اہتمام کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ الفوز الکبیر میں اس کی معرفت کو المواضع الصّعبة (مشکل مقامات) سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح (واضح / جدا جدا) کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے لہٰذا جن علماء نے اس کی افادیت اور تاریخی حیثیت کو "لا طائل" (بے فائدہ) کہا ہے، ان کا موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور دیگر بعض علماء نے اس میں غلو کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر تفسیر قرآن نہیں ہو سکتی اور علامہ سیوطیؒ اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر قرآن پر اِقدام کو حرام قرار دیتے ہیں تاہم یہ دونوں گروہ اِفراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اصل اور صحیح موقف ان کے بین بین ہے جیسا کہ ابن دقیق العیدؒ اور ابوالفتح قشیریؒ نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس فن کی معرفت فی الجملہ معاون ہو سکتی ہے ورنہ تفسیر قرآن صرف اس پر موقوف نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ اپنے مقدمة التفسير میں لکھتے ہیں:

معرفة سبب النزول تعيّن على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبّب "سببِ نزول کی معرفت آیت کے سمجھنے میں معاون ہے کیونکہ سبب کی معرفت کے ذریعے مسبّب تک رسائی ہو جاتی ہے"

حقیقتِ حال: صحابہ یا تابعین نے جو اَسبابِ نزول بیان فرمائے ہیں، وہ دو قسم پر ہیں: اول وہ جن کی طرف خود آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً مغازی یا دیگر واقعات کہ جب تک ان واقعات کی تفصیل سامنے نہ ہو متعلقہ آیت میں مذکورہ جزئیات ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کے اسبابِ نزول کے متعلق تو واقعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کے لئے اِن پر عبور لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے تاریخ جاہلیت اور مغازی کی معرفت کو قرآن فہمی کے لئے لازمی قرار دیا ہے کیونکہ متعلقہ آیات میں ان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

لیکن دوسری قسم کے اسبابِ نزول وہ ہیں جنہیں صحابہ یا تابعین کسی آیت کے تحت نُزِلَتْ فی كذا یا أنزل الله في كذا کے الفاظ سے ذکر کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کو ایک طرف کی مناسبت سے تو آیت کے تحت ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ آیت کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے ان کی معرفت لازمی نہیں ہے (فتاویٰ ج ۳، ص ۳۳۸، ۳۴۰) شاہ ولی اللہؒ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں:

"وقد ذكر المُفسّرون تلك الحادثة بقصد الإحاطة بالآثار المناسبة للآية أو بقصد بيان ماصدق عليه العموم وليس هذا القسم من الضروريات..... وكان

غرضهم تصوير ما صدقت عليه الآية"

"بسا اوقات مفسرین آیت کے تحت کوئی واقعہ اس مقصد سے ذکر کر دیتے ہیں کہ اس آیت سے مناسبت رکھنے والے واقعات جمع ہو جائیں یا جس امر کی عموم تصدیق کر رہا ہو اس کی وضاحت ان کا مقصود ہوتی ہے۔ یہ قسم ضروری اسبابِ نزول سے نہیں ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس امر کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے جس پر آیت صادق آسکتی ہے"

پہلی قسم کے اسباب کے بیان میں چونکہ صحابہؓ کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سراسر روایت وسماع پر مبنی ہوتا ہے۔ اس بنا پر علما نے بلا اختلاف اس کو حدیثِ مسند کا درجہ دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں

"وإذا ذكر سببا نزلت عقبه فإنهم كلهم يدخلون مثل هذا في المسند، لأن مثل ذلك لايقال بالرأي" "صحابی جب کسی آیت کے سبب نزول میں "اس کے معا بعد یہ آیت نازل ہوئی" جیسے الفاظ استعمال کرے تو اس طرح کی روایات حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہیں کیونکہ اس طرح کی بات فقط رائے سے نہیں کہی جاسکتی"

اور دوسری قسم (یعنی جب کوئی صحابی نَزَلت في كذا کے الفاظ استعمال کرے) میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد ورائے پر ہے۔ امام حاکم علوم الحدیث میں لکھتے ہیں :

وإذا أخبر الصحابي الذي شهد الوحي والتنزيل عن آية من القرآن أنها نزلت في كذا، فإنه حديث مسند و مشى على هذا ابن الصلاح وغيره

"جب کوئی صحابی جو نزولِ وحی / آیت کے وقت موجود تھا، قرآن کی کسی آیت کے بارے میں خبر دے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو یہ بھی حدیثِ مرفوع ہے، یہی رائے ابن صلاحؒ وغیرہ کی بھی ہے"

مگر حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل و توزیع کے قائل نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ان الفاظ سے سبب نزول مراد ہے تو یہ تمام کے نزدیک حدیثِ مسند میں داخل ہے اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے (مگر اس کا سببِ نزول نہیں ہے) تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں۔ امام بخاریؒ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں لیکن دوسرے علماء اس کا انکار کرتے ہیں اور اکثر مسانید اسی اصطلاح کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔ جیسے مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ اور اکثر علماء کا میلان بھی امام احمد بن حنبل کی طرف ہے، چنانچہ زرکشیؒ لکھتے ہیں:

"قد عرف من عادة الصحابة والتابعين أن أحدهم إذا قال نزلت هذه الآية في كذا فإنه يريد بذلك أنها تتضمن هذا الحكم لا أن هذا كان السبب في نزولها فهو من جنس الاستدلال على الحكم بالآية إلامن جنس النقل لما وقع"

"صحابہؓ و تابعینؒ کی یہ معروف عادت ہے کہ جب وہ "یہ آیت فلاں مسئلے میں نازل ہوئی" کہیں تو اس سے ان کی یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ آیت اس حکم کو شامل ہے نہ کہ فلاں واقعہ اس آیت کا سببِ نزول ہے۔ پس صحابہؓ کا یہ کہنا آیت سے کسی حکم کے بارے میں استدلال کرنے کی قبیل سے ہوتا ہے نہ کہ واقعہ کی خبر نقل کرنے کی جنس سے" (ج ۱ ص ۳۱، ۳۲)

الغرض اسبابِ نزول کے بیان میں صحابہ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو صحابی کو خود بھی اپنے بیان پر اعتماد نہ ہوتا اور وہ أحسب هذه الآية نزلت في كذا (میرا گمان ہے کہ یہ آیت فلاں واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا لہٰذا اسبابِ نزول کے بیان میں احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم صحابہ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ واحدیؒ لکھتے ہیں: "لايحل القول فى أسباب نزول الكتاب إلابالرواية والسماع ممن شاهدوا التنزيل ووقفوا على الأسباب و بحثوا عن علمها"

"کتاب اللہ کے اسبابِ نزول کے بارے میں کچھ کہنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہی صحابہ کی روایت اور سماع معتبر ہے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور وہ اس کے اسباب سے واقف تھے اور اسی کے جاننے کے لئے بحث و کرید میں لگے رہتے تھے۔"

اس بنا پر سلف رحمہم اللہ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک کسی صحابی سے صحتِ سند کے ساتھ اس کا مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہؒ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

"اتق الله وقل سدادا ذهب الذين يعلمون فيما أنزل القرآن"

"اللہ سے ڈرو اور کھری بات کہو، وہ لوگ چلے گئے جو جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا؟"

لیکن ان کے بعد علماء نے اس سلسلہ میں تساہل سے کام لینا شروع کر دیا حتیٰ کہ کذب بیانی کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ علامہ واحدی اسی قسم کے علماء پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأما اليوم فكل أحد يخترع شيئا و يختلق إفكا وكذبا ملقيا زمامه الى الجهالة غير مفكر فى الوعيد للجاهل بسبب الآية"

"اور آج تو یہ حالت ہے کہ ہر ایک کوئی چیز گھڑ لیتا، جھوٹ بنا لیتا ہے، اپنی لگام جہالت کے سپرد کرتے ہوئے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ آیت کے سببِ نزول سے ناواقف کے لئے کیا وعید ہے؟"

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شانِ نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور اپنی تفاسیر میں رطب و یابس کو جمع کر دیا بلکہ مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا۔ حتیٰ کہ امام طبریؒ جیسے مؤرخ اور مفسر بھی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اس نوع کی تفسیری روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے اور جب تک کسی حادثہ کا صحتِ اسناد سے سببِ نزول ہونا ثابت نہ ہو جائے محض تفسیری روایت کی بنا پر اسے قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

اسبابِ نزول کی حیثیت

یہاں پر یہ بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ کوئی آیت اپنے نفس الامری مفہوم اور عموم کے اعتبار سے سببِ نزول کے ساتھ مقید و مختص نہیں ہوتی بلکہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کو عموم پر ہی محمول کرنا ضروری ہے۔ علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

''اصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو اس کے عموم پر محمول کیا جائے اور اسبابِ خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے..... کیونکہ صحابہ کرامؓ پیش آمدہ واقعات کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گو ان کے اسبابِ نزول خاص تھے''

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: (ج۱۵ص۳۶۴ و ایضاً ص۴۵۱)

"قَصْر عمومات القرآن على أسباب نزولها باطلٌ فإن عامة الآيات نزلت بأسباب اقتضت ذلك وقد علم أن شيئا منها لم يقصر على سببه"

''عمومِ قرآن کو اسبابِ نزول پر محدود کر دینا باطل ہے کیونکہ اکثر آیات ایسے اسباب کے تحت نازل ہوئی ہیں جو اس کے مقتضی تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ کوئی آیت بھی اپنے سببِ نزول تک محدود نہیں ہے'' (بلکہ عموم لفظ کے اعتبار سے اس میں وسعت ہے)

اور پھر آگے چل کر (ص۴۵۱ پر) لکھتے ہیں:

"ورود اللفظ العام على سبب مقارن له فى الخطاب لا يوجب قصره عليه..... غاية مايقال: إنها تختص بنوع ذلك الشخص فتعم ما يشبهه.....الخ"

''کسی عام لفظ کا خطاب کے مخصوص سبب کی بنا پر آنا اس کو اس سبب سے مقید نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں آئے ہیں اور اس سے ملتے جلتے لوگوں کو یہ الفاظ شامل ہوں گے''

خلاصۂ کلام: مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسبابِ نزول دو قسم پر ہیں بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہو پاتا۔ لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو علمائے تفسیر نے اسباب کے طور پر ذکر کر دیئے ہیں ورنہ درحقیقت نہ تو وہ اسبابِ نزول ہی ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کر لینے سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل پیش آتی ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے ''الفوز الکبیر'' میں تصریح کی ہے۔ نیز یہ کہ کوئی بھی آیت اپنے سببِ نزول کے ساتھ مختص نہیں ہوتی

بلکہ اسے عموم پر رکھنا ضروری ہے۔

(ب) اِسرائیلیات کی حیثیت

بلاشبہ قرآن پاک کو دوسری کتبِ سماویہ پر مُھَیمِن (نگہبان) کی حیثیت حاصل ہے اور اس نے بعض واقعات اور مسائل کے بیان کرنے میں تورات سے موافقت بھی کی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی وِلادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج واُسلوب کی اِتباع سے گریز کیا ہے اور ان واقعات کی غیر ضروری جزئیات کو ترک کر کے صرف انہی حصص کے بیان پر اکتفا کی ہے جن کا تعلق عبرت و موعظت سے ہے یا ان واقعات کو اہل کتاب کے سامنے بطورِ استشہاد پیش کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں اہل کتاب کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایات بھی قبول کیں تاہم صحابہ کرام نے نقل و روایت میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث "حدّثوا عن بني إسرائيل ولا حرج" (بنی اسرائیل سے روایت کرلو، اس میں کوئی حرج نہیں!) کے پیش نظر جواز کی حد تک اِن سے اِستفادہ کیا ہے اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن وحدیث اور اِسلامی عقائد سے متصادم نہ تھیں۔ (مقدمہ اصول تفسیر از ابن تیمیہؒ، ص ۲۶)

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسرائیلیات کی روایت تو جائز ہے لیکن بلادلیل اس کی تصدیق یا تکذیب جائز نہیں ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

"إذا حدّثكم أهلُ الكتاب فلاتصدّقوهم ولاتكذّبوهم فأما إن يُحدّثوكم بحق فتكذبوه وأما إن يحدثوكم بباطل فتصدّقوه"

"جب تمہیں اہل کتاب کوئی واقعہ ذکر کریں تو اس کی تصدیق کرو نہ اس کو جھٹلاؤ، مبادا وہ تمہیں سچی خبر دے رہے ہوں تو تم اُن کو جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں غلط خبر دے رہے ہوں اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو"

جن صحابہ نے اہل کتاب سے روایت لی ہے ان میں سے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان صحابہؓ کی مرویات ملاحظہ کرنے سے ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کی روایات بطورِ استشہاد نقل ہوئی ہیں نہ کہ کلیتًا انہی پر اعتماد کیا گیا ہے۔

اسرائیلیات اور تابعین

البتہ صحابہ کے بعد تابعین نے اہل کتاب سے اَخذِ روایت میں توسع سے کام لیا اور ہم سمجھتے ہیں تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ اس دور میں

بہت سے اہل کتاب مسلمان ہوگئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لئے اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، اِس دور میں مفسرین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب ویابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنالیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ (۱۱۴ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس مشغلہ نے خاصی ترقی کرلی اور ہر قسم کی خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ دورِ تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔ اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی بعض تحریروں میں اس کی تصریح کی ہے۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں: "إن النقل عن بني إسرائيل دسيسة دخلت في ديننا"

"بنی اسرائیل سے روایت کرنا ایک پوشیدہ مکر ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگیا ہے"

لہٰذا قرآن کے ایک طالب علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ذکر میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور وفکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل وروایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد اور معاون ہوں اور پھر سنت سے ثابت بھی ہوں (روح المعانی، ج۱۵ ص ۹۳) اور اس سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کا توجہ سے مطالعہ بہت مفید ہوسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تفسیر میں متعدد مقامات پر اسرائیلیات پر تنقید کی ہے۔ البتہ اختلاف کی صورت میں ایک مؤلف ان سب کو نقل کرکے ان میں سے صحیح بات کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ پھر بہتر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اسرائیلیات کو کلیتاً ترک کرکے قرآن پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا جائے جیسا کہ قرآن نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے (الفوز الکبیر: ص۴۵، ۴۶) خصوصاً قصص کے باب میں اِجمال و تفصیل کے موقع پر خود قرآن سے تفصیلات کو اَخذ کرنے کو ایک رہنما اصول قرار دیا ہے۔

خلاصۂ بحث: صحابہ کرامؓ نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان سے روایت کو جائز سمجھا ہے تاہم اس میں حزم واحتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور اسرائیلیات کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلہ میں قبول تو کرسکتے ہیں مگر ان کو میزانِ صحت قرار نہیں دے سکتے۔

(ج) لغت ومحاورات

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ سے بھی روشنی نہ پڑتی ہو اور تابعین بھی اس کی تاویل میں مختلف ہوں تو پھر لغت عرب اور محاورات کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی

کے سلسلہ میں خود صحابہ کرامؓ اس اصل سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"الشعر ديوان العرب فاذا انعاجم علينا شيئ من القرآن رجعنا اليه"

"شعر اہل عرب کا دیوان ہے، جب ہمیں کوئی لفظ اجنبی معلوم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے" (مقدمہ اصولِ تفسیر لابن تیمیہؒ)

لیکن اس عنصر سے استفادہ ہر ایک کے بس کے بات نہیں صرف وہی شخص اس عنصر کو بروئے کار لاسکتا ہے جو عربی زبان میں خصوصی ذوق رکھتا ہو۔ دواوین عرب اُسے مستحضر ہوں اور عربی زبان کے اَسالیب سے بدرجہ اَتم واقفیت رکھتا ہو۔ محض لغات بینی سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ معاجم و قوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اور بلااسناد مختلف اقوال کو جمع کر دیا ہے، خصوصاً اَشعار و اَمثال جن کو حضرت ابن عباسؓ دیوانُ العرب قرار دے رہے ہیں۔ علماءِ ادب جانتے ہیں کہ اشعار کی نسبت میں اِختلاط و اِختلاف کو بے حد دخل ہے اور شاذونادر ہی کوئی ایسی روایت ہوتی جس پر اعتماد ہو سکے پھر محاوراتِ عرب کے بیان میں بھی باہم اختلاف ہے اور علمائے لغت نے تشریحات میں عمومی لغت و محاورہ کو سامنے رکھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ الفاظِ قرآن کی تشریح و توضیح ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لغتِ قرآن ان کے سامنے ہے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے تشریحات کی ہیں تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ علمائے لغت بھی مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجۂ اَتم موجود ہے۔ لہٰذا لغت و محاورہ سے استفادہ کے لئے چند اُمور کا پیش نظر رہنا ضروری ہے:

(ا) لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے صرف اُن معانی کو پیش نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت سمجھے جاتے تھے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ عام لغت سے صرفِ نظر کر کے اولاً لغتِ قرآن و سنت کو سامنے رکھا جائے اور پھر عام لغت پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"ويرجع فى ذلك إلى لغة القرآن أوالسنة أوعموم لغة العرب"

"اس کے لئے سب سے پہلے لغتِ قرآن و سنت یا عام اہل عرب کی لغت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔" (فتاویٰ، ج ۱۳، ص ۳۷۰) ..... اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"والقرآن نزل بلغة قريش الموجودة في القرآن، فإنها تفسير بلغته المعروفة فيه إذ وُجدت لايُعدَل عن لغته المعروفة مع وجودها وإنما يحتاج إلى غير لغته في لفظ لم يوجد له نظير فى القرآن" (فتاویٰ، ج ۱۵ ص ۸۸)

"اور قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا جو قرآن میں موجود ہے۔ اس کی معروف لغت کے مطابق تفسیر کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی لفظ اس میں موجود پایا جائے تو اس کی معروف لغت سے انحراف کرنا درست نہیں۔ دوسری لغات کی طرف تب رجوع کیا جائے گا جب اس کی نظیر قرآن میں نہ ملتی ہو"

بایں ہمہ قواعدِ اعراب وبلاغت سے اس کے معنی ترکیبی پر غور کر لیا جائے اور سیاق وسباق پر نظر ڈال لی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنی متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

"انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرحِ غریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے: اولاً مواردِ استعمال پر نظر ڈالے اور ترکیبِ کلام اور سیاق وسباق کے اعتبار سے جو معنی زیادہ مناسب نظر آئیں اُنہیں اختیار کیا جائے"

اس ساری تگ ودو کے باوجود یہ معنی اجتہادی ہوں گے اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ بقول شاہ صاحب ایک ہی کلمہ لغتِ عرب میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۲) مندرجہ بالا طریق سے جو بھی متعین ہو اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت ﷺ کی ہدیٰ وسیرت کے بھی مطابق ہے؟ اور آپؐ کے اقوال وافعال اور تفسیر صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کونی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام غور وفکر اور مساعی اس لئے ضروری ہیں کہ کتبِ لغت بہر حال کتبِ لغت ہیں، ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے۔ وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر حال قاصر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قرآن کے اصطلاحی الفاظ کی تشریح لغت سے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کا دماغی خلل ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے تفسیر کی کوشش کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ کی مجاز القرآن ہے۔ دراصل علماءِ بدعت نے اپنے نظریات کی ترویج کے لئے اس طریق تفسیر کو رواج دیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں جس کی مدد سے ہم آیت کا مفہوم متعین کر سکیں۔ ہاں صرف مفردات کی وضاحت کے سلسلہ میں کتبِ لغت کچھ نہ کچھ کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ علامہ طبریؒ لکھتے ہیں:

"مفرداتِ قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں ہے"

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مواردِ استعمال کا تتبع کسی حد تک مفرداتِ قرآن کے معانی حل کرنے اور سمجھنے میں تو معاون ہو سکتا ہے اور ہے، تاہم یہ ایسا ذریعہ اور عنصر نہیں ہے کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے

تفاسیر میں لغت و محاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لئے شواہد تک کو چھان مارا ہے انہوں نے بھی اپنی تفسیروں میں سنت اور اقوالِ صحابہؓ سے اعتنا کیا ہے بلکہ ان کو مقدم رکھا ہے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے احادیث اور اقوال صحابہؓ سے مدد حاصل کی ہے۔

یہ ہیں وہ عناصر یا بنیادی اُصول جن سے قرآن فہمی کے سلسلہ میں بالترتیب اِستفادہ ضروری ہے ان کے علاوہ تاریخ جاہلیت پر عبور بھی قرآن فہمی میں معاون ہو سکتا ہے کیونکہ بعض آیات میں جاہلی تمدن اور ان کی عادات کی تردید مذکور ہے۔

☆ قرآن فہمی کے بنیادی اُصول ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ان اُمور کا جاننا ضروری ہے جو قرآن فہمی سے مانع اور حجاب بنتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"قرآن پاک کتابِ ہدایت ہے لہٰذا اسے کتاب ہدایت سمجھ کر ہی نہایت توجہ اور تدبر سے پڑھا جائے اور زندگی کے مشکل مسائل کے حل کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور قاری قرآن کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے مستغنی رہے۔"

آخر میں فرماتے ہیں: "وفي الجملة تكون همّته عاكفة على مراد ربه من كلامه"

"الغرض اس کی تمام تر کوشش قرآن کریم سے اللہ کی مراد سمجھنے میں صرف ہونی چاہئے"

بعض قارئین تلاوتِ قرآن میں حسن صوت اور اَدائے مخارج میں اس قدر تصنع اور تکلف کرتے ہیں کہ اصل مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں اور حسن قراءت کے یہ مقابلے دراصل قرآن فہمی سے حجاب بنتے ہیں۔ اس طرح اعراب، قواعدِ فصاحت وبلاغت میں استغراق بھی فہم قرآن سے مانع بن جاتا ہے۔ قرآن کے متن پر غور کی بجائے محض تفسیری مطالعہ اور اقوالِ رجال کو جمع کرنے کا مشغلہ بھی وہ حجاب ہے جو قرآن کی روح تک پہنچنے سے مانع رہتا ہے اور جو لوگ قرآن کی تلاوت ہی محض اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے خصوصی نظریات کی تائید حاصل کریں وہ ہمیشہ قرآن فہمی سے دور رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

وكل محجوبون بما لديهم عن فهم مراد الله من كلامه في كثير من ذلك أو أكثره

ہمارے ملک میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو قرآن سے عدول کر کے الٰہیات کے مسائل کا حل فلاسفہ اور متکلمین یا صوفیا کی کتابوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے مقابلہ میں ایسی کتابوں کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس قماش کے مدہوشین کے متعلق فرماتے ہیں: "وهولاء أغلظ حجابا عن فهم كتاب الله"

"کہ اس قسم کے لوگ قرآن فہمی سے کوسوں دور ہیں"

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن فہمی کی سعادت سے ہمکنار فرمائے اور دلوں کو اپنی رحمت سے نواز دے تاکہ دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کر سکیں..... وما ذلك على الله بعزيز!

دارالافتاء

شیخ الحدیث حافظ ثناءاللہ مدنی
جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ)

- ذکر واذکار میں گنتی متعین کر لینے اور تسبیح پھیرنے کا حکم؟
- مُحدّث میں شائع شدہ دو جوابوں پر اعتراضات کا جائزہ
- کاروبار میں شراکت، مالِ وراثت کی تقسیم.....
- مسند احمد کی ایک روایت پر سوالات کے جوابات

☆سوال: ذکر میں اپنی طرف سے گنتی متعین کرنے نیز تسبیح پھیرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ذکر اذکار اور وِرد و وظائف کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص میں جہاں کہیں تعداد اور وقت کا تعین ہے، وہاں اُن کا اہتمام ہونا چاہیے اور جس جگہ ان کو مطلق چھوڑا گیا ہے وہاں اپنی طرف سے متعین کرنا بدعت کے زمرہ میں شامل ہے۔ صحیح حدیث میں ہے" من احدث فی أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ" یعنی "جو دین میں اضافہ کرے وہ اضافہ نا قابل قبول ہے"

مسنون وِرد وظائف میں گنتی سو سے زیادہ منقول نہیں ہے۔ علامہ البانی نے سلسلة الاحاديث الضعيفة میں اس امر کی تصریح کی ہے۔ پھر مسنون ذکر دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں پر ہونا چاہیے جس طرح کہ سنن ابوداود مع عون المعبود (۱/۵۵) میں عبداللہ بن عمرو کی روایت میں راوی ابن قدامہ سے اس کی صراحت موجود ہے اور اس میں حکمت یہ بیان ہوئی ہے کہ قیامت کے روز یہ آدمی کے لیے گواہ بن کر آئیں گی، فرمایا" وأن يقعدن بالأنامل فانهن مسئولات مستنطقات" اور جہاں تک مروّجہ تسبیح کا تعلق ہے تو اس بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ صاحبِ عون المعبود گٹھلی اور کنکریوں پر ذکر کے جواز والی حدیث کی بنا پر منکے والی تسبیح کے جواز کے قائل ہیں اور آپ نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"وهذا أصل صحيح لتجويز السبحة بتقريره ﷺ فإنه في معناها إذ لا فرق بين المنطوقة والمنثور فيما يُعدّ به ولا يعتدّ به بقول من عدّها بدعة"

"یعنی یہ (گٹھلی وغیرہ والی) حدیث تسبیح کے جواز کے لیے صحیح بنیاد ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس فعل کو برقرار رکھا اور تسبیح بھی اس کے ہم معنی ہے۔ پروئے اور غیر پروئے دانوں کے شمار میں لانے میں کوئی فرق نہیں اور اس کے قول کی کوئی حیثیت نہیں جس نے اس کو بدعت قرار دیا ہے" (عون المعبود ۱/۵۵۵، ۵۵۶)

اور علامہ سیوطیؒ نے اس کے جواز پر مستقل ایک رسالہ تصنیف کیا جو الحاوي للفتاوي میں مطبوع ہے۔ دوسری طرف شیخ ابن بازؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ شریعتِ مطہرہ میں ہمیں مسبّحۃ (تسبیح کی مالا) کے ساتھ تسبیح کرنے کے جواز کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی چنانچہ صرف مسنون پر اکتفا کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ تسبیح صرف اُنگلیوں پر پڑھی جائے اور دوسرے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ انگلیوں کو استعمال کرنا افضل ہے جس طرح نبی ﷺ کا معمول تھا۔ بہت سارے اہل علم نے تسبیح کے استعمال کو مکروہ سمجھا ہے کیونکہ یہ نبی ﷺ کے عمل کے خلاف ہے۔

سعودی عرب کے بزرگ ترین عالم دین شیخ ابن عثیمین نے اس کے عدمِ استعمال پر چند وجوہ بیان کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) ایسا کرنا تعلیم نبوی ﷺ کے خلاف ہے کیونکہ آپ نے پوروں پر تسبیح کی تلقین فرمائی ہے

(۲) اکثر اوقات اس میں ریاکاری پائی جاتی ہے بالخصوص وہ لوگ جو اس کو ہار کی طرح گلے میں لٹکا لیتے ہیں

(۳) بایں صورت غالباً آدمی کا دل ودماغ حاضر نہیں ہوتا اور وہ صرف منکوں پر اعتماد کر کے مقصد اعلیٰ کی طرف توجہ نہیں دیتا یا غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر میرے خیال میں افضل یہ ہے کہ آدمی مُسَبّحۃ پر تسبیح نہ کرے بلکہ انگلیوں کے پوروں پر تسبیح کرے اور صاحبِ کتاب السنن والمبتدعات محمد عبدالسلام خضر نے بھی منکے پر منکا ڈالنے کو ریاکاری اور سُمعہ (دکھلاوا) میں شمار کیا ہے (فصل فی الریاء وبا لطقطقة بالمسبحة ص۲۵۶)

میرے خیال میں بھی افضل یہ ہے کہ آدمی انگلیوں پر تسبیح کرے جس طرح حدیث میں نص موجود ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص عددِ منصوص کو قائم نہ رکھ سکتا ہو تو بامر مجبوری حدیث النوی والحصی کی بنا پر مسبّحۃ کو استعمال میں لانے کی گنجائش ہے لیکن حدیثِ ہذا ضعیف ہے مشکوٰۃ بتحقیق الالبانی (۲/۷۱۵)۔ اس بنا پر صرف منصوص پر اکتفا کرنا چاہیے اور وہ عدد غالباً کم تعداد میں ہے جس کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔ پھر عام حالات میں ذکر اذکار کا سلسلہ بلا تعیین تعداد کسی نہ کسی صورت میں جاری رہنا چاہیے، مطلقاً ترک کر دینا درست عمل نہیں ہے۔

☆ سوال: محرم رمئی ۹۹ء کے محدث میں آپ نے نمازِ تسبیح کو عام حالات میں سنت قرار دیا ہے، مگر سعودیہ کے تمام علماء بشمول شیخ ابن بازؒ نمازِ تسبیح کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ ازراہِ کرم مزید وضاحت فرمائیے۔ علاوہ ازیں سابقہ شوہر سے نکاح کے بارے میں سوال کا جواب بھی ناکافی معلوم ہوتا ہے جس سے مریض دل کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (محمد اختر، ریاض)

جواب: نمازِ تسبیح کی صحت میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جن میں سے ابن العربی، نووی نے شرح المهذب میں، ابن قیم، ابن عبدالہادی، مزی، ابن حجر نے التلخیص میں اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس

میں موسیٰ بن عبدالعزیز مجہول ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے اس کو صحیح یا حسن کہا ہے ان میں سے ابو بکر الآجری، ابو محمد عبدالرحیم مصری، حافظ ابوالحسن مقدسی، ابوداود صاحبِ سنن، مسلم صاحبِ صحیح، حافظ صلاح الدین العلائی، خطیب، ابن صلاح، سبکی، سراج الدین بلقینی، ابن مندہ، حاکم، منذری، ابو موسیٰ مدینی، زرکشی اور نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں، ابوسعید سمعانی، حافظ ابن حجر نے في الخصال المكفّرة اور اَمالی الاذکار میں، ابو منصور دیلمی، بیہقی، دارقطنی اور دیگر اہل علم رحمہم اللہ نے بھی اس پر صحت یا تحسین کا حکم لگایا ہے۔

علامہ ابوالحسن عبیداللہ مبارکپوریؒ فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک حق اور درست بات یہ ہے کہ ابن عباسؓ کی حدیث ضعیف نہیں چہ جائیکہ اس پر من گھڑت یا جھوٹی ہونے کا حکم لگایا جائے بلکہ بلا شبہ میرے نزدیک یہ حسن درجہ سے کم نہیں بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ شواہد کی بنا پر اس حدیث کو صحیح لغیرہ قرار دیا جائے"۔ پھر آپ نے معترضین کے اعتراضات کا جائزہ پیش کر کے اس کو قابل حجت قرار دیا ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح ۲/ ۲۵۳) حدیث ہذا پر تفصیلی گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو کتاب اللآلی المصنوعة از علامہ سیوطی اور تحفۃ الاحوذی۔

علامہ البانی حفظہ اللہ مشکوٰۃ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں:

"فإن للحديث طرقا وشواهد كثيرة يقطع الواقف فان للحديث أصلا أصيلا خلافا لمن حكم عليه بالوضع أو قال إنه باطل"

"اس حدیث کے بہت سارے طرق اور شواہد ہیں جن پر مطلع ہونے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یقیناً اس حدیث کی اصل موجود ہے بخلاف اس کے جس نے اس پر من گھڑت ہونے کا حکم لگایا ہے یا کہا کہ یہ حدیث باطل ہے۔"

مزید فرماتے ہیں کہ علامہ ابو الحسنات لکھنوی نے الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة (ص ۳۵۳، ۳۷۴) میں کافی تحقیق کی ہے۔ جو شخص مزید تفصیل چاہتا ہے اسے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے، ان سب سے کفایت کرتی ہے۔ (۱/ ۴۱۹)

اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ جن علماء نے صلاۃ تسبیح کو بدعت قرار دیا ہے، ان کا نظریہ مرجوح ہے بلکہ بدلائل قویہ اس کا مسنون ہونا ثابت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو أجوبة الحافظ عن أحاديث المصابيح في آخر المشكوٰة بتحقيق الألباني حفظه الله

(۲) سوال ہذا کے جواب کو امریکی عدالت کی خلع کی کاروائی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جو نفس بحث میں موجود ہے۔ اس کے ضمن میں ذکر ہوا ہے کہ اگر یہ عورت سابقہ شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو بھی کر سکتی ہے شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں، مقصد یہ ہے کہ خلع کی صورت میں رجوع نہیں ہو سکتا البتہ دوبارہ نکاح کی گنجائش موجود رہتی ہے۔

لہٰذا جواب میں کوئی ایسا ابہام نہیں جس سے بیمار دل فائدہ اٹھا سکتا ہو۔ امید ہے تھوڑی سی وضاحت تشفی کے لیے کافی ہوگی۔

☆ والد کے ساتھ بیٹے کی کاروباری شراکت، قرضہ کی موجودگی میں وراثت کی تقسیم؟

جواب: صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ اصلاً کاروبار کا تعلق متوفی سے ہے اور محنت میں بڑا بھائی بھی شریک ہے۔ میت کے کل ترکہ سے اولاً اس کا قرضہ اتارا جائے پھر بڑے بھائی کو اس کی محنت کا معقول معاوضہ دینا چاہیے پھر بقیہ مال ۱/۲ کی نسبت سے لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دینا چاہیے یعنی فی کس لڑکی کے لیے ایک حصہ اور لڑکے کے دو حصے۔

قرض کی ادائیگی کا تعلق جملہ جائداد سے ہوتا ہے چنانچہ جیسے بھی ممکن ہو ہر صورت قرض ادا ہونا چاہیے اور قرض اُتارنے میں تعاون کرنا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ کی قبیل سے ہے جو باعثِ اجر و ثواب فعل ہے۔ جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ترکہ کی میت کی طرف نسبت ایک جیسی ہے اور شادیوں کے اخراجات چونکہ حوائج وضروریات کی قبیل سے ہیں جو کسی شمار میں نہیں آتے لہٰذا ترکہ میں ان کا حساب نہیں ہوگا۔ مرحوم نے اولاد کی شادیوں پر اپنی خوشی سے جو کچھ خرچ کیا اس کے ذمہ دار وہ ہیں اور جو کچھ بعد میں شادی پر خرچ ہوا اس کا ذمہ دار خرچ کرنے والا ہے۔ ہاں اگر اس کی بھی ذمہ داری والد نے قبول کی تھی تو پھر ذمہ دار قرار پاسکتے ہیں ورنہ نہیں۔ نیز بہنوں کو چاہیے کہ ربّ العالمین کی تقسیم کے مطابق اپنا حصہ وصول کر لیں اور اگر برضا و رغبت کسی کو کچھ دینا چاہیں تو ممانعت بھی نہیں ہے۔

☆ میت کا ترکہ ۵ بیٹیوں، ۳ بیٹوں اور شوہر میں کس طرح تقسیم ہوگا جبکہ والدہ کی وفات کے بعد ایک بیٹی کی بھی وفات ہو چکی ہے۔ اس بیٹی کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

جواب: ورثاء کے شرعی حصص ملاحظہ فرمائیں: کل حصص: ۴۴

شوہر	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکا	لڑکا	لڑکا
۱۱	۳	۳	۳	۳	۳	۶	۶	۶

پانچ بیٹیوں سے ایک بیٹی جو مرحومہ کے بعد فوت ہوئی، اس کی وراثت کا حق دار صرف باپ ہے (جو میت کا شوہر ہے) کیونکہ باپ کی موجودگی میں بھائی اور بہنیں وراثت سے محروم ہوتے ہیں۔

☆ سوال: مسند احمدؒ کی اس روایت کے بارے میں مفتیانِ کرام و محدثین عظام کیا فرماتے ہیں:

حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا زيد بن الحباب حدثني حسين ثنا عبد الله بن بريدة، قال: دخلت أنا وأبي على معاوية فأجلسنا على الفرش ثم اتينا بالشراب فشرب معاوية ثم ناول أبي ثم قال ماشربتُه منذ حرّمه رسول الله

ﷺ ثم قال معاوية كنت أجمل شباب قريش وأجوده ثغرا، وما شيئ كنت أجد له لذّة كما كنت آجده وانا شابّ غير اللبن أو إنسان حسن الحديث يحدثني

''عبداللہ بن بریدہؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے والد بریدہؓ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے ہمیں زمین پر بٹھایا پھر ایک مشروب منگوایا جسے حضرت معاویہؓ نے پیا اور میرے والد نے لینے کے بعد کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کے حرام کردینے کے بعد سے اس کو نہیں پیا۔ پھر معاویہؓ کہنے لگے میں قریش کا سب سے خوبصورت دانتوں والا حسین ترین نوجوان تھا۔ جوانی میں جس طرح مجھے اشیاء میں لذت محسوس ہوتی وہ آج نہیں، سوائے دودھ کی لذت کے یا کسی خوش گفتار انسان کی بات سننے کے'' (مسند احمد بن حنبل: جلد ۵/ص ۳۴۷)

براہِ مہربانی درج ذیل اُمور کی مع حوالہ جات وضاحت فرمائیں:

۱۔ محدثین کے نزدیک اس روایت کی اِسنادی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ وہ کون سا مشروب ہے جو حضور ﷺ کی ممانعت کے باوجود حضرت معاویہؓ نے تناول فرمایا؟

۳۔ ماشربتُه میں شربتُ کا فاعل کون ہے؟ (خورشید احمد، اسلام آباد)

جواب: اِس حدیث کی سند کے بارے میں حافظ نورُ الدین ہیثمی کہتے ہیں: ورجالهٗ رجال الصحيح ''اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔'' (مجمع الزوائد ۵/ ۴۲ طبع دارالکتاب بیروت)

۲۔ احتمال ہے کہ یہ انگور کی شراب کے علاوہ نبیذ ہو اور معاویہؓ نے اُسے اس قدر پیا ہو جس سے نشہ نہ آتا ہو۔ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ سے مروی ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے کہ انگور کے علاوہ جس شے کی زیادہ مقدار سے نشہ پیدا ہوتا ہو اُس کی اُس قدر مقدار حلال ہے جو نشہ آور نہ بنتی ہو۔ معاویہ ان لوگوں سے ہیں جن کا مسلک ہے کہ اگر قلیل مقدار نشہ آور نہ ہو تو اس کا پینا جائز ہے۔

جبکہ جمہور اور بہت سارے صحابہؓ کا مسلک اس سے مختلف ہے کہ جس کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ انہی میں سے حضرت بریدہ بھی ہیں۔

۳۔ ماشربتُهٗ میں شربتُ کا فاعل بریدہؓ ہیں۔ (ملاحظہ ہو فتح الربانی: ۱۷/ ۱۱۵)

☆ سوال: ہمارا چھوٹا بھائی مقبوضہ کشمیر میں شہید ہوا، اس کے دو چھوٹے بچے (بیٹا اور بیٹی) ہیں اب اس کی بیوہ نے ہمارے دوسرے چھوٹے بھائی سے شادی کرلی ہے۔ کیا اب بھی شہید بھائی کے بچے یتیم ہیں اور ان سے یتیموں جیسا سلوک ہونا چاہیے؟ یا اب یتیمی ختم ہوگئی ہے؟

جواب: یتیم کا زمانہ ماں کے آگے شادی کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حد بچوں کا بالغ ہونا ہے، بچے جب سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو یتیمی کا دور اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ: اليتم انقطاع الصبى عن أبيه قبل بلوغه (المفردات: کتاب الیاء ص ۵۵۰)

''بچے کا اپنی بلوغت سے قبل ہی اپنے باپ سے جدا ہو جانے کا نام یتیمی ہے۔'' ☆☆

تحقیق و تنقید

مولانا ارشاد الحق اثری
ممبر اسلامی نظریاتی کونسل

سانحۂ کربلا میں اِفراط و تفریط کا جائزہ

[بعض تسامحات کا تذکرہ]

محترم و مکرم مولانا عبدالرحمٰن مدنی صاحب..... زادکم اللہ عزاً و شرفاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاجِ گرامی!

"محدث" الحمدللہ ہر ماہ باقاعدہ مل رہا ہے بلکہ اس کے وقیع مضامین کی بنا پر اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اس ماہنامہ کے ذریعہ جو علمی جہاد آپ کر رہے ہیں ہیں، اسے شرفِ قبولیت سے نوازے..... آمین!

گذشتہ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ کے شمارہ ۵ میں ایک مضمون کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے مولانا عبدالرحمٰن عزیز نے "سانحۂ کربلا میں افراط و تفریط کا جائزہ" کے عنوان سے رقم فرمایا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی رجل رشید اس پر توجہ فرمائے گا مگر اس کے بعد شمارہ نمبر ۶ موصول ہوا تو یہ خیال خواب ثابت ہوا یا کسی مہربان نے شائد اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس لئے مجبوراً اپنے احساسات کا اظہار آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آئندہ شمارہ میں اسے شائع کردیں گے تاکہ اس موضوع سے متعلق ایک دوسرا پہلو بھی قارئین کرام معلوم کر سکیں۔ (اثری)

جنابِ محترم! آپ اور تاریخ و رجال سے دلچسپی رکھنے والے سبھی حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے مابین پیدا ہونے والے نزاعات / مشاجرات کے نتیجہ میں ان میں جو فکری اختلاف پیدا ہوا، ان میں رافضی، خارجی اور ناصبی نظریات اور ان کے اہداف کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ان کے مقابلہ میں اہلسنّت / اہلحدیث ہی ایک فکر ہے جو بحمداللہ صراطِ مستقیم پر قائم رہا، جادۂ اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور افراط و تفریط کی پگڈنڈیوں سے محفوظ رہا۔ رافضیوں کے برعکس اہل بیت کے ساتھ ساتھ سب صحابہ کرام کا احترام اُن کا جزوِ ایمان ہے۔ ناصبی جس طرح خاندانِ نبوت اور ان کے ہم نواؤں کے ساتھ عناد رکھتے تھے یا خارجیوں نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ کے بارے میں جو طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا تھا، اہل سنت ان نظریات سے ہمیشہ بیزاری کا اظہار کرتے رہے۔ ایک کے دفاع میں دوسرے کی تنقیص ان کا قطعاً شیوا نہیں رہا۔ مگر سخت حیرت کی بات ہے کہ "سانحۂ کربلا میں افراط و

تفریط کا جائزہ" پیش کرتے ہوئے خود مولانا عبدالرحمٰن عزیز صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر افراط و تفریط کا شکار ہوگئے۔ اور جب یہ تحریر "محدث" جیسے علمی ماہنامہ میں شائع ہوئی تو گویا یہ سب محدثین رحمہم اللہ کے افکار کی امین جماعت کے موقف کی ترجمان بن گئی، حالانکہ ایسا قطعاً نہیں مثلاً

حضرت حجر بن عدی (صحابی) کو سبائی لیڈر کہا گیا

(۱) کہا گیا ہے کہ حضرت حسنؓ کی امیر معاویہؓ سے مصالحت ہوئی تو کوفیوں نے حضرت حسنؓ کو ورغلانے کی کوشش کی۔ بلکہ حضرت حسنؓ کی اس مصالحت کو بھی انہوں نے ناگوار سمجھا ..... چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن عزیز کے الفاظ ہیں :

"حضرت حسنؓ نے جب اپنے حواریوں سے تنگ آکر حضرت امیر معاویہؓ سے مصالحت کر کے بیعتِ خلافت کی تو سبائیوں کو انتہائی ناگوار گزرا۔ ان کی برابر کوشش ہی تھی کہ صلح نہ ہونے پائے چنانچہ سبائی لیڈر حجر بن عدی نے حضرت حسنؓ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو حضرت حسنؓ نے اسے بڑی سختی سے ڈانٹا" (محدث، ص ۱۴)

قطع نظر اس کے کہ حضرت حسنؓ نے یہ مصالحت "حواریوں سے تنگ آکر کی تھی یا اس کے اور بھی اَسباب تھے، مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جن "سبائیوں" کو یہ مصالحت ناگوار گزری، ان کے جس "سبائی لیڈر" کا نام حَجَر بن عَدِي لیا گیا ہے، یہ کون ہے؟

جنابِ من! یہ سبائی لیڈر حجر بن عدي صحابی رسول ہیں..... ابن اثیرؒ لکھتے ہیں:

"وفد على النبيﷺ هو وأخوه هانئ و شهد القادسية وكان من فضلاء الصحابة" (اسد الغابہ: ج ۱، ص ۳۸۵)

کہ "حضرت حجرؓ اور ان کے بھائی ہانی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وفد کی صورت میں حاضر ہوئے۔ جنگِ قادسیہ میں شریک ہوئے اور فضلائے صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔"

امام حاکم نے مستدرک ج ۳ ص ۴۶۸، حافظ ابن حجر نے الاصابہ ج ۱ ص ۳۴۹، حافظ ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۶۳، تجرید اسماء الصحابہ ص ۱۲۳، العبر ج ص ۵۷، تاریخ الاسلام ج ۲ ص ۳۳، ابن حمادؒ نے شذرات الذہب ج ۱ ص ۵۷، ابن حزمؒ نے جمہرۃ انساب العرب ص ۴۲۶، اور ابن عساکرؒ وغیرہ نے انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ابن سعدؒ نے صحابہ میں ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "أما أن يكون ظنه آخر وأما أن يكون ذهل" کہ انہوں نے یہ کوئی اور راوی سمجھا ہے یا ان سے بھول ہوئی کہ حجر بن عدیؓ کو تابعین میں بھی ذکر کر دیا۔

امام بخاریؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام ابن حبانؒ نے بلاشبہ انہیں تابعین میں شمار کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں

جبکہ ابو بکر بن حفص جیسے تابعی ان کے بارے میں "حجر بن عدی رجل من اصحاب النبی ﷺ" فرماتے ہیں (الاصابہ) اور مصعبؒ بن عبداللہ الزبیری جیسے امام بھی انہیں صحابی قرار دیتے ہیں اور اکثر متاخرین کی بھی یہی رائے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں "قال غیر واحد وفد مع أخیه هانئ" (السیر) لہٰذا ان پر "سبائی لیڈر" کا الزام اہل سنت کے فکر کی آئینہ دار نہیں۔ اسی "جرم" کی بنا پر مولانا عبدالرحمٰن عزیز نے ان پر "رضی اللہ عنہ" کی علامت بھی مناسب نہیں سمجھی...... یہ رویہ بھی بہر نوع غلط ہے۔

حضرت سلیمانؓ بن صرد خزاعی کو بطورِ صحابی متعارف نہیں کرایا گیا

(۲) اسی طرح چند سطور بعد مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں :

"حضرت حسینؓ نے کوفی لیڈر سلیمان بن صرد کو یہ جواب دیا" (محدث ص ۱۴)

آگے چل کر موصوف اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

"آخری خطوط کوفہ کے بڑے بڑے سرداروں کی جانب سے تھے جن میں سے سلیمان بن صرد، شیث بن ابی یزید، عزرہ بن قران، عمر بن حجاج زیدی، عمر بن تمیمی، حبیب بن نجد، رفاعہ بن شداء اور حبیب بن مظاہر قابل ذکر ہیں" (محدث ص۱۶)

جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان "کوفی لیڈروں" میں جو سرِ فہرست "سلیمان بن صرد" ہیں، وہ بالاتفاق مشہور صحابی حضرت سلیمانؓ بن صرد خزاعی ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان سے روایات مروی ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ حوالہ جات کی ضرورت ہی نہیں۔ بلاریب انہوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط لکھے۔ جب ان کی مدد نہ کرسکے تو ندامت کا اظہار بھی کیا۔ ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کوفی لیڈروں میں حضرت سلیمان بن صرد خزاعی معروف صحابی ہیں۔ ان کے اسی "جرم" کی بنا پر مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کے نام پر بھی "رضی اللہ عنہ" کی علامت مناسب نہیں سمجھی۔ یہ روِش بہر نوع درست نہیں جس سے ناصبیّت کی بو آتی ہے۔

(۳) انہی خط لکھنے والوں میں ایک جعدہ بن ہبیرہ بن ابی وہب ہے جیسا کہ محدث ص ۱۴ میں ہے جبکہ یہ بھی صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں جنہیں نبی کریم ﷺ کا شرفِ زیارت حاصل ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ (ج ۱ ص ۲۴۷، ۲۶۹) میں بیان کیا ہے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے یہاں بھی "رضی اللہ عنہ" کی علامت مناسب نہیں سمجھی۔

مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں سلف کے موقف سے اہل علم واقف ہیں۔ سلف نے اس بارے گفتگو کی جو ممانعت کی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ اس سے احترام و تقدسِ صحابہ کرامؓ پر حرف آتا ہے اور ان کے بارے میں ناروا زبانیں کھل جاتی ہیں۔ افسوس کہ مضمون کے مذکورہ مقامات سے اسی کی بو

آرہی ہے، اسی امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

مقامِ یزید بن معاویہ امام احمد بن حنبل کی نظر میں

(۴) اسی عنوان کے تحت (بحوالہ خطباتِ بخاری ص ۳۸۵) لکھا گیا ہے:

"امام احمد بن حنبلؒ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ "یزید بن معاویہ سے روایت نہ لی جائے۔" امام احمدؒ کا دین اور پرہیزگاری میں بڑا بلند مقام ہے اور روایات قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ بنابریں امام احمد کی مستند کتاب سے یزید بن معاویہ کی روایت نقل کر دینا ہی یزید کی ثقاہت کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب الزہد میں یزید بن معاویہ کا قول نقل کیا ہے کہ یزید اپنے خطبہ میں کہا کرتا تھا (اس روایت کو قاضی ابو بکر ابن العربی نے اپنی مایہ ناز کتاب العواصم من القواصم میں بھی ذکر کیا ہے)۔ "جب تم میں سے کوئی بیمار ہو کر قریب المرگ ہو جائے اور تندرست ہو جائے تو وہ غور کرے۔ جو افضل ترین عمل ہوں ان کو لازم پکڑے پھر اپنے کسی بدترین عمل کو دیکھے تو اسے چھوڑ دے" .....

یزید کا یہ قول نقل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یزید کا مقام امام احمدؒ کی نگاہ میں بلند تھا یہاں تک کہ اسی کو آپ نے ان زاہد صحابہ اور تابعین میں شمار کیا ہے جن کے اقوال کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کے وعظ سے لوگ گناہ چھوڑتے ہیں" (محدث ص ۳۲)

مجھے سمجھ نہیں آئی کہ امام احمدؒ کے قول کے لئے "خطباتِ بخاری" پر انحصار کیسے کیا؟ جس بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ "امام احمدؒ بن حنبل سے یہ بات منسوب کی گئی ہے....." یہ بہرحال "خطبات" ہیں۔

واضح رہے کہ امام احمدؒ کی طرف سے یہ "منسوب" ہی نہیں بلکہ امام ابو بکر الخلالؒ نے بھی اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لایذکر عنه حدیث" (المنتخب من العلل للخلال ص ۲۳۷ لابن قدامہؒ) اور حافظ ذہبیؒ نے بھی میزان الاعتدال ج ۴ ص ۴۴۰ میں ان کا یہی قول ذکر کیا ہے۔ اسی لئے یہ بات محض فقط "منسوب" نہیں، ایک حقیقت ہے کہ واقعتاً امام احمد کا یہ فرمان ہے۔

رہی یہ بات کہ "امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں ان کا قول نقل کیا ہے....." یہ عبارت العواصم من القواصم ص ۳۷۰ مترجم سے حرف بحرف نقل کی گئی ہے اور العواصم کے عربی ایڈیشن ص ۲۳۳ میں یہ عبارت موجود ہے۔ مگر اس کے بعد امام ابن العربیؒ نے جو فرمایا، اسے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے نقل نہیں کیا بلکہ وہ شاید اس سے بے خبر ہیں چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

"نعم وما أدخله إلا في جملة الصحابة قبل أن يخرج إلى ذكر التابعين"

جس کا ترجمہ مترجم ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجئے..... "ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ امام احمدؒ

نے یزید کو صحابہ میں درج کیا ہے اور پھر اسی کے بعد تابعین کا تذکرہ کیا ہے"

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو "العواصم" کے حوالے سے یزید کی پاکدامنی اور اس کے زہد و تقویٰ کی دلیل بیان فرما رہے ہیں، وہ ذرا امام ابن العربیؒ کے اس موقف کی طرف بھی توجہ دیں کہ امام احمدؒ نے تو یزید کو صحابہ میں درج کیا ہے۔ ہم تو اس پر إنا لله وإنا إليه راجعون کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ عہدِ عثمانِ غنیؓ میں پیدا ہونے والا یزید صحابہ میں! ایں چہ بوالعجبی است اور پھر اس قول کا انتساب امام احمدؒ کی طرف "ظلمات بعضها فوق بعض" کا مصداق ہے۔

امام ابن العربیؒ بلاشبہ بہت بڑے امام، فقیہ اور مفسر گزرے ہیں مگر تھے تو انسان ہی۔ یہ کہنے میں یقیناً ان سے سہو ہوا۔ بالکل اسی طرح یہاں یزید بن معاویہ بن ابی سفیان سمجھنے میں بھی ان سے سہو ہوا۔

اولاً تو تتبع بسیار کے باوجود کتاب الزہد سے یزید بن معاویہ کا یہ قول نہیں ملا۔ البتہ امام عبداللہ بن مبارک نے کتاب الزہد بروایت نعیم بن حماد ص ۳۹ رقم ۱۵۶ میں یہی قول "أنا حنظلة بن أبي سفيان قال نا ابن أبي ملكية قال سمعت يزيد بن معاوية يقول في خطبته...... الخ" نقل کیا ہے۔

ثانیاً: یہاں یزید بن معاویہ سے ابن ابی سفیان نہیں بلکہ الکوفی النخعی مراد ہیں جو کہ تابعی تھے اور کوفہ کے عابدین وزاہدین میں ان کا شمار ہوتا تھا جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۰ میں اسی کا تذکرہ کیا ہے۔ امام احمدؒ کی کتاب الزہد ص ۳۶۷ میں ان کے صاحبزادے عبداللہ کے زوائد میں اسی یزید بن معاویہ النخعی کا ایک اور قول بھی ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہاں ابن ابی سفیان مراد لینا بالکل اسی طرح امام ابن العربیؒ کا وہم ہے جیسا کہ یزید بن معاویہ کو صحابی کہنے اور یہ قول امام احمدؒ کی طرف منسوب کرنے میں وہم ہوا۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ العواصم کے حاشیہ میں علامہ محب الدین الخطیب نے جابجا اپنی آرا کا اظہار کیا ہے مگر وہ اس مقام پر امام ابن العربیؒ کی اس فروگذاشت پر خاموشی سے گزر گئے پھر اس کے تراجم اور حواشی لکھنے والے حضرات نے بھی یہاں خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ معلوم نہیں کیوں؟ یزید کی صفائی میں حقائق سے آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارنا کوئی تحقیقی اور علمی خدمت نہیں۔

ہمارا مقصد یہاں نہ یزید کا دفاع ہے نہ اس کے مثالب و محامد پر بحث مطلوب ہے بلکہ زیر نظر مضمون میں امام احمدؒ کے حوالہ سے یزید کے بارے میں ایک بات ذکر ہوئی بس اس کی حقیقت بیان کرنا ہے...... إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله العلي العظيم

جہاد و قتال

مولوی خرم علی بلہوریؒ
(رفیق جہاد سید احمد شہیدؒ)

رسالہ☆ ترغیبُ الجہاد

جماعتِ مجاہدین، جسے شہیدین سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تحریکِ احیاءِ سنتؐ کے نتیجے میں آج سے ۱۷۵ برس قبل منظم کیا تھا، مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس دور میں جب تختِ دہلی پر انگریز اور تختِ لاہور پر سکھ راج کی حکومت تھی، مسلمانانِ ہند کو منظم کر کے صوبہ سرحد کو اپنا مستقر بنا کر اس تحریک کے سرفروشوں نے ایک نئی داستانِ شجاعت رقم کی۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۴ء تک پھیلی مجاہدین کی ان سرگرمیوں اور کامیابیوں نے امتِ مسلمہ میں ایک نئی روحِ جہاد پھونک دی۔ اس جہاد کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ مجاہدین جن کا ہندوستان بھر سے مالی اِعانت کا ایک منظم جال تھا، نے آزاد علاقوں (صوبہ سرحد کے بعض شہروں) میں اپنا ٹھکانہ بنا کر جہاد کا احیاء کیا، کیونکہ اسی صورت میں وہ جہاں غیروں کی جہادی مقاصد میں دخل اندازی سے محفوظ رہ سکتے تھے وہاں جہاد کے خاطر خواہ نتائج بھی حاصل کر سکتے تھے..... جہاد اسلام کی بلند ترین چوٹی اور امتِ مسلمہ کی عزت کی ضمانت ہے۔ امتِ مسلمہ کے ساتھ ساتھ آخری دم تک جہاد بھی باقی رہے گا۔

شہیدینؒ اور ان کے رفقائے گرامی قدر مسلمانانِ ہند میں جہاد کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے جو کوششیں بروئے کار لائے ان مبارک کوششوں میں سے ایک زیر نظر رسالہ ترغیب الجہاد کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جسے سید احمدؒ کے رفیق جہاد مولوی خرم علی بلہوریؒ نے تحریکِ جہاد کے آغاز میں عوام کو جہاد کی ترغیب دینے کے لئے تحریر کیا تھا۔ یہ رسالہ اس موضوع پر مفیدِ عوام ہونے کے ساتھ ساتھ خصوصی تاریخی مناسبت بھی رکھتا ہے۔ بڑی بوسیدہ حالت میں اس کا مخطوطہ میسر آنے پر اس کو تحقیق و تکمیل اور مروّجہ اُردو کے قالب میں ڈھال کر 'محدث' کے اَوراق پر محفوظ کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو جہاد ایسی مبارک تحریک کے احیاء کی توفیق بخشے اور ہمارے حکمرانوں کو اس کی سرپرستی کرنے کی ایمانی قوت سے نوازے..... آمین! (حسن مدنی)

مخطوطہ کا مختصر تعارف: جہاد کے موضوع پر لکھے ہوئے اس قلمی نسخے پر نہ تو مصنف کا نام ہے اور نہ ہی کاتب کا۔ میں نے اس مخطوط کا ذکر جامعہ سلفیہ، فیصل آباد کے انچارج لائبریری جناب اشرف جاوید سے کیا تو ان کی حیرت انگیز یادداشت نے میری رہنمائی کی اور مجھے ایوب قادری مرحوم کی کتاب "اُردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ" دیکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کتاب میں مولانا خرم علی بلہوریؒ کے تذکرہ میں رسالہ ترغیب الجہاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قلمی تحریر مولانا عبدالخالق قدوسی شہید کی ملکیت تھی۔ قادری مرحوم نے ایک اور مخطوطہ کا مطالعہ بھی کیا جو رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔

مشفق خواجہ صاحب نے اپنی کتاب جائزہ مخطوطات اردو میں مزید دو نسخوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ایک صولت پبلک لائبریری، رام پور میں ہے۔ دوسرا کراچی میں قاضی فضل عظیم کے پاس ہے۔ قادری مرحوم نے قدوسی نسخے اور مشفق خواجہ صاحب نے قاضی فضل عظیم کے نسخے سے اقتباسات بھی درج کئے ہیں۔

میرا ملکیتی مخطوطہ 15x23 سائز کے تیرہ ورق رچوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر اوسطاً تیرہ سطریں ہیں۔

☆ پیشکش: علی ارشد، فیصل آباد ..... تکمیل و تحقیق: حافظ حسن مدنی

کاغذ دبیز اور مٹیالا ہے۔ خط اچھا اور حالت بہترین ہے۔ قدیم طرزِ تحریر میں لکھا ہوا ہے۔ معروف اور مجہول 'یے' میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ دو چشمی "ے" اور کہنی دار "ہے" میں بھی کوئی فرق نہیں، گاف پر ایک ہی مرکز ڈالا گیا ہے اور لفظوں کو جوڑ کر لکھا گیا ہے۔ پونے دو سو سال پرانے طرزِ تحریر میں لکھے ہوئے اس مخطوطے کو پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے لیکن مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کیونکہ ہندی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور تعجب یہ کہ ایسا کوئی لفظ بھی مطالعہ میں نہیں آیا جو موجودہ زمانے میں متروک ہو چکا ہو۔

میں نے نقل تیار کرتے وقت معمولی سا تصرف یہ کیا ہے کہ عبارت کو جدید طرزِ تحریر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایوب قادری مرحوم اور مشفق خواجہ صاحب نے جو اقتباسات درج فرمائے ہیں، ان میں اور میرے زیر مطالعہ نسخہ کی عبارت میں چند مقامات پر اختلاف ہے۔ اسے بیان کر دیتا ہوں :

قدوسی مخطوطے کی عبارت ہے کہ "حضرت سید صاحب صرف اسلام کی حفاظت کے واسطے تھوڑے مسلمانوں کو لے کر" جبکہ اس رسالہ میں آپ پڑھیں گے کہ "حضرت سید احمد صاحب صرف اسلام کی حمایت کے واسطے نہ ملک و مال کی طمع سے، اللہ پر بھروسہ کر کے چند مسلمانوں کے ساتھ کابل اور قندھار و پشاور کی طرف گئے"

قاضی فضل عظیم اور قدوسی رسالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ شائع ہونے والے مخطوطہ کے چھ باب اور ایک فصل (خاتمہ) ہے۔ قاضی اور قدوسی رسالہ کی اختتامی عبارت میں کوئی خاص فرق نہیں جو اس طرح ہے۔ "ہر چند جہاد کا حال مختصر بیان ہو چکا تا آخر" دیکھئے ایوب قادری مرحوم کی کتاب "اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ" صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴ مشفق خواجہ کی کتاب "جائزہ مخطوطات" (اردو) صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۶

اس رسالہ میں آپ پڑھیں گے کہ "اے مسلمانو! جب تم نے ترغیب جہاد کے ثواب سنے تا آخر"

قاضی فضل عظیم کی تحویل میں جو مخطوطہ ہے، اس پر بھی کاتب کا نام نہیں لیکن مشفق خواجہ صاحب نے خط کی مدد سے قاضی محمد حسن رضا کا نام متعین کیا ہے جو مصنف کے رشتہ دار تھے۔

مصنفِ رسالہ کے مختصر سوانح

مشفق خواجہ صاحب کی کتاب جائزہ مخطوطاتِ اردو، مولانا غلام رسول مہر کی کتاب جماعت مجاہدین، محمد ایوب قادری کی کتاب اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ، مولوی رحمٰن علی کی کتاب تذکرۂ علمائے ہند ترجمہ محمد ایوب قادری اور ابو یحییٰ امام خان نوشہروی کی کتاب تراجم علمائے حدیث ہند کی مدد سے رسالہ ترغیبُ الجہاد کے عالی قدر مصنف مولوی خرم علی بلہوری کی سوانح حیات کا مختصر خاکہ لکھنے پر اکتفا کروں گا:

مولوی خرم علی بلہوری مضافات کانپور میں پیدا ہوئے۔ امام نوشہروی نے لکھا ہے کہ بلہور لکھنؤ کے نواح میں ہے۔ پہلے مقلد تھے، منع قرأۃ فاتحہ خلف الامام پر رسالہ لکھا، جب شاہ اسمٰعیل شہید کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباعِ سنت کا رنگ چڑھ آیا اور سید احمد شہید کے خلفا کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔ اساتذہ میں مولانا مرزا احسن علی صغیر محدث لکھنوی اور مولانا نور لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر حدیث کی سند لی۔ ایک سو مجاہدین کا دستہ لے کر سرحد پہنچے۔ سید شہید نے انہیں واپس بھیج دیا تاکہ ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کا کام جاری رہے۔ ان کا انتقال ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) کو قصبہ آسیون میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ صرف امام خان

نوشہروی نے سن وفات ۱۲۶۰ھ لکھا ہے۔ شاعر بھی تھے۔ مشہور نظم 'جہادیہ' لکھی جس کی طباعت پر انگریزوں نے پابندی لگادی تھی۔ (علی ارشد)

ترغیبُ الجہاد

اس قادرِ مطلق کے لئے بے شمار حمد جو پربت کو رائی کرے اور رائی کو پربت کرے۔ جو مچھر سے نمرود کو مرواڈالے اور جس کی مدد سے موسیٰ فرعون ایسے ظالم بادشاہ کو ملک مصر سے نکالے، جس قوم کو چاہے ملک کا مالک بنادے اور پھر جب چاہے تو ایک پل میں مٹادے اور تحفۂ درود اُس کے رسولِ کریم ﷺ پر جنہوں نے پہلے کافروں کو نرمی سے سمجھایا۔ جب نہ سمجھے، تب جہاد کیا اور ان کی آل اور اصحاب پر، جنہوں نے تلوار کے زور سے عرب سے عجم تک کو اسلام سے آباد کیا۔

اب ہندوستان میں کفر کا بہت غلبہ ہوگیا ہے۔ سکھ قوم لاہور وغیرہ میں مدت سے حاکم ہیں اور بہت ظلم کرتی ہیں۔ ہزاروں مسلمانوں کے ناحق خون کرڈالے اور ہزاروں کو بے عزت کیا، اذان کہنا، گائے ذبح کرنا بالکل موقوف کردیا۔ جب ان کا ظلم حد سے گزرا تو حضرت سید احمد صاحب صرف اسلام کی حمائت کے واسطے نہ ملک، مال کی طمع سے، اللہ پر بھروسہ کرکے چند مسلمانوں کے ساتھ کابل اور قندھار و پشاور کی طرف گئے اور اس طرف مسلمانوں کو غفلت سے جگایا اور ہمت دلائی، بارے ہزاروں مسلمان اللہ کی راہ میں مستعد ہوئے جبکہ ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) سے کفار سکھ سے جہاد شروع ہوگیا ہے۔

حضرت سید صاحب کی خوش نیتی سے حق تعالیٰ نے چار بار لشکرِ اسلام کو پے در پے فتح دی اور کافروں کو شکستِ فاش ہوئی۔ لیکن پھر بھی مسلمان تھوڑے ہیں، نہ ان کے پاس ملک، نہ مال اور کافر صاحبِ ملک ومال، جس کی فوج ہی تین لاکھ سوار اور پیادہ۔ اب مسلمانوں پر فرض ہے کہ جلد لشکرِ اسلام میں ملیں، شریک ہوں۔ لیکن ہندوستان کے اکثر مسلمان جہاد کے مضمون سے خبردار نہیں کہ جہاد کس کو کہتے ہیں اور یہ ہم پر فرض ہے یا نہیں؟ جہاد کا کتنا ثواب ہے اور اس میں نہ جانا کتنا عذاب؟ تو اس واسطے اس خیر خواہِ اسلام کے دل میں آیا کہ قرآن مجید اور حدیث شریف سے تھوڑا جہاد کا حال لکھوں اور اس کا ترجمہ ہندی زبان میں کروں تاکہ سب مسلمان اس کو سمجھیں اور جہاد کے لئے مستعد ہوجائیں۔ الحمدللہ میرا ارادہ پورا ہوا اور یہ رسالہ ترغیب الجہاد چند روز میں تیار ہوگیا۔ حق تعالیٰ سے امید ہے کہ اس رسالے کو اپنی رحمت سے مقبول کرے اور مسلمان اس کو پڑھ کر گھربار کی محبت کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں تیار ہوجائیں۔ آمین یارب العالمین!

پہلا باب..... جہاد کی فرضیت

کافروں کو مستعد ہوکر دین اسلام سکھانا، جب نہ مانیں تو ان سے جان ومال سے لڑنا، اس کو شریعت میں جہاد کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرة:۲۱۶)

"اے مسلمانو! تم پر کافروں سے لڑنا فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہارے نفس کو برا لگتا ہے اور بہتیری چیزوں کو برا کہتے ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہیں اور بہتیری چیزوں کو تم اچھا سمجھتے ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بد ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

یعنی جہاد کرنا تمہارے حق میں بہت بہتر ہے کہ سب دوسرے دین والوں پر غلبہ ہو لیکن تمہارے نفس کو بہ سبب تکلیفِ جان ومال برا لگتا ہے، جیسے بیمار کو کڑوے علاج برے لگتے ہیں مگر جب کڑوی دوا کھالی جائے تو اچھا ہو جاتا ہے اور اللہ کی راہ میں نہ جانا تم کو اچھا لگتا ہے، جیسے ہیضہ کے مریض کو کھانا پینا اچھا لگتا ہے مگر اس کے حق میں کھانا پینا برا ہے۔ آخر کار اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے، تم کیا جانو؟ تو جب آنحضرت ﷺ کے دور میں جہاد فرض ہوا تو حق تعالیٰ نے جہاد کا ثواب بیان فرمایا اور بہشت کا وعدہ کیا اور سب اہل ایمان دنیا سے جھک گئے اور جان ومال سے جہاد کے لئے مستعد ہو گئے۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو جہاد کرنا فرض ہے، مشقت کے خیال سے اس میں سستی کرنا بہتر نہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: الجهاد واجب عليكم مع كل أمير برّا كان أو فاجرا والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم برّا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر......

"تم پر ہر مسلمان سردار کے ساتھ جہاد واجب ہے وہ نیک ہوں یا بدکار۔" (سنن ابوداود، کتاب الجہاد)

یعنی جیسے ہر مسلمان کا نماز پڑھنا درست ہے خواہ امام متقی ہو خواہ فاسق، اسی طرح جہاد کرنا فرض ہے، مسلمان سردار کے ساتھ ضروری ہے۔ سردار کا معصوم ہونا کچھ ضروری نہیں جیسے شیعہ کہتے ہیں۔ ایسے سبب مدام دولتِ جہاں سے محروم ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار کے بغیر مثل بلوائی اور ہلڑ کے جہاد درست نہیں۔ مسلمانوں سے اوّلاً، ایک شخص کو اپنا امام اور سردار بنالینا چاہیے۔

قال النبي ﷺ الجهاد ماض منذ بعثني الله عزوجل إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجّال (سنن ابوداود)

"رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہاد ہمیشہ جاری رہے گا جب سے مجھے اللہ نے پیغمبر بنایا ہے یہاں تک کہ میری پچھلی اُمت دجال سے لڑے گی"

بعض جاہل یوں کہتے ہیں کہ جہاد پیغمبر اور ان کے صحابیوں کے بعد ختم ہو گیا۔ اب جہاد کا زمانہ نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے بلکہ جہاد امتِ محمدی تک جاری رہے گا اور کسی کے مٹانے سے نہیں مٹے گا۔

دوسرا باب...... جہاد کے لئے نہ جانے کا وبال

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الفَاسِقِيْنَ﴾ (سورۂ توبہ:۲۴)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادری اور مال جو کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور حویلیاں جو پسند رکھتے ہو، تمہیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہیں، تو انتظار کرو کہ اللہ کا اپنا فیصلہ آن پہنچے اور اللہ بے حکم لوگوں کو راہ نہیں دیتا"

اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ جو لوگ ماں، باپ، بیوی، لڑکی، مال، کاروبار اور مکانوں کی محبت میں پڑے ہیں اور جہاد میں شریک نہ ہوں گے ان کو عذابِ الٰہی (قحط اور بیماری وبا وغیرہ) ضرور ہوگا اور وہی لوگ فاسق اور ہدایتِ الٰہی سے بے نصیب ہیں۔ ایک اور مقام پر اللہ فرماتا ہے: (التوبہ:۳۸)

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ . اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ وَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾

"ایمان والو! تمہیں کیا ہوا ہے جب کہے اللہ کی راہ میں کوچ کرو تو زمین پر پڑھے جاتے ہو کیا آخرت چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر ریجھے، سو آخرت کے حساب سے دنیا کا جینا کچھ نہیں مگر تھوڑا"

کچھ نہیں دنیا کے مزے جیسے یہاں مٹی کا کھیل، جس کی کچھ حقیقت اور پائیداری نہیں سو اس چند روزہ دنیا پر ریجھنا اور آخرت کو جس کو کبھی فنا نہیں چھوڑنا، نادانوں کا کام ہے۔

﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (التوبہ:۳۹)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اگر جہاد میں نہ نکلو گے تو تم کو دکھ والا عذاب کرے گا اور بدل لائے گا تمہارے سوا اور لوگ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑو گے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

پھر اگر تم جہاد میں نہ جاؤ گے، سستی کرو گے تو اور لوگوں سے اپنے دین کو غالب کرے گا اور تم اپنی سستی کی وجہ سے سخت عذاب میں پڑو گے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرتؐ نے ایک عرب قبیلہ کو جہاد کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے جہاد پر جانا قبول نہ کیا، اس برس اللہ تعالیٰ نے ان پر پانی نہ برسایا۔ اس لئے ان پر قحط پڑا

﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "خوش ہیں پیچھے رہنے والے، بے شبہ رہ کہ خلاف رسول اور اللہ کے اور برا لگا کہ اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑیں، اور بولے منافقوں اور نا سمجھوں کا کام ہے اور کہنے لگے کہ اس گرمی میں (جہاد کو) نہ نکلنا۔ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس سے شدید گرم ہے کاش کہ یہ سمجھتے ہوتے۔" (سورۂ توبہ:۸۱)

سچے مسلمانوں کا یہ طریق نہیں، اس واسطے کہ سچے مسلمان تو جب آتش دوزخ کی گرمی اور عذاب کا دھیان کرتے ہیں تو جہاد کی راہ کی سب تکلیفیں بھول جاتے ہیں اور سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اللہ کی راہ میں نہ کچھ گرمی، سردی ان کو روکے، نہ برسات قدم ہٹائے۔ ہر چند یہ آیتیں حضرت

ﷺ کے وقت میں اُن لوگوں پر اتری تھیں لیکن جہاد تو قیامت تک جاری ہے۔ پھر جو ان کی طرح جہاد میں سستی کرے گا وہ بھی انہیں میں گنا جائے گا..... مطلب کام سے، نہ کہ نام سے!!

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: "پچھلے زمانہ میں قوم ہوگی، جہاد کو کچھ نہ سمجھیں گے اور رب نے یہ ٹھانا ہے کہ جو بندہ اس کو ملے گا ایسی سمجھ والا تو اس کو ایسے ماروں گا کہ ویسے سخت مار تمام عالم میں کسی کو نہیں" (ابن عساکر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا انکار کرنا اور جہاد کرنے والوں پر ہنسنا جیسے کہ اس زمانہ کے بعض ہندی بھی کرتے ہیں، نہایت برا ہے کیونکہ جہاد غلبہ دین کا سبب ہے۔ جو اس پر ہنسا وہ معاذ اللہ دین محمدیؐ کا منکر ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ما ترك قوم الجهاد فى سبيل الله إلا سلط الله عليهم ذلاً لا ينزعه حتى يرجعوا دينهم

"لوگ اللہ کی راہ میں لڑنا چھوڑیں گے تب اللہ ان کو ذلیل کرے گا۔ اور یہ ذلت ان سے اس وقت تک دور نہ ہوگی جب تک وہ اپنے دین میں نہ لوٹیں"

حضرت نے سچ فرمایا کہ جب جس نے جہاد چھوڑا، وہی ذلیل اور بے قدر ہوئے جیسے ہندوستانی لوگ کہ نااتفاقی اور عیش اور آرام کے سبب ذلیل اور نا خیر (بے فائدہ) ہو رہے ہیں۔

تیسرا باب..... جہاد کی خوبی اور ثواب

﴿ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جو لڑے گا اللہ کی راہ میں، پھر مارا جائے یا غالب ہو تو ہم جلد اس کو دیں گے بڑا ثواب" (النساء: ۷۴)

﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ☆ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ☆ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے لڑے، اللہ کے پاس ان کا بڑا درجہ ہے اور وہ مراد کو پہنچے۔ ان کو ان کا رب اپنی طرف سے مہربانی اور رضامندی اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کو ہمیشہ کا آرام ہوگا اور وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے اور اللہ کے پاس تو بڑا ثواب ہے۔" (التوبہ: ۲۰ تا ۲۲)

یہ مرتبہ حق تعالیٰ نے حضرت کے اصحاب کو تین کاموں کے بدلے دیا: ایمان لانے پر اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے سے اور جہاد کرنے پر، اب جو کوئی ان کے سے کام کرے گا اور ہجرت کر کے جہاد میں شریک ہوگا، اس پر بھی اللہ کی وہی رحمت ہوگی۔ سبحان اللہ، جان بھی اسی کی اور مال بھی لیکن جو اپنی خوشی سے اس کی راہ میں جان اور مال حاضر کرتا ہے تو اس پر اللہ اپنے کیا کیا کرم کرتا ہے۔ اب ایسے قدردان مالک کو پا کر، گھر بار کی محبت میں پڑا رہے اور اس کی راہ میں سستی کرے تو وہ بڑا نادان ہے اور نہایت بے نصیب!

﴿ انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ

خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (سورۂ توبہ:۴۱)

"اے مسلمانو! نکلو ہلکے ہو اور بوجھل، اور اس کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑو"

یعنی اہل عیال کی طرف سے ہلکے ہو یا بوجھل، سواری ملے یا نہ ملے، ہتھیار ہوں یا نہ ہوں، جوان ہو یا بوڑھے، دبلے ہو یا موٹے۔ غرض کہ تم کو آسان ہو یا مشکل، جہاد ضرور کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیبؒ بیمار تھے۔ جب وہ جہاد کو چلے تو لوگوں نے کہا کہ یا حضرت! تم بیمار ہو اور معذور، جہاد میں تمہارا جانا ضروری نہیں۔ فرمایا کہ قرآن میں ہلکے یا بوجھل کو جہاد کا حکم ہے اگر مجھ سے لڑائی نہ ہو سکی تو میں لوگوں کے اسباب کی رکھوالی کروں گا اور مسلمانوں کی جماعت بڑھے گی۔ اگر مسلمان ہزار ہیں تو ہزار اور ایک ہو جائیں گے ..... تفسیر نیشاپوری میں یوں روایت ہے کہ ایک ضعیف، جس کی پلکیں بڑھاپے کے باعث لٹک پڑی تھیں، وہ جہاد کو جانے لگا۔ کسی نے کہا کہ تم نہایت ضعیف ہو تم پر جہاد لازم نہیں، بولے کہ اللہ نے ہلکے اور بوجھل سب کو جہاد کا حکم کیا ہے، سبحان اللہ! اسلام اس کا نام اور مسلمان اس کو کہتے ہیں

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اللہ مسلمانوں سے ان کی جان اور مال کو اس قیمت پر مول لے چکا کہ ان کے لئے بہشت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اس کے ذمہ کا تورات، انجیل اور قرآن میں وعدہ ہو چکا، اور کون اللہ سے زیادہ قول کا پورا ہے۔ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اور اس سے اور بھی بڑی مراد ملے۔" (سورۂ توبہ:۱۱۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ روزِ اوّل سے مسلمان اپنے جان اور مال کو بہشت کے بدلے بیچ چکا ہے اور معلوم ہے کہ جو جس چیز کو بیچے وہ اپنے اختیار سے نکل جاتی ہے۔ اب صاف معاملہ کی بات ہے کہ اپنے جان اور مال کو اللہ کی راہ میں بے حیلہ اور بلا تکرار حاضر کریں اور اپنی قیمت کو لیں، سبحان اللہ! عجیب قسمت اس جان اور مال کی، جس کا اللہ خریدار ہو اور جس کی قیمت بہشت ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (الحجرات:۱۵)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مؤمن وہ ہیں جو اللہ پر اور رسول پر یقین لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور جانوں سے لڑے، وہی لوگ سچے ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ جہاد میں اپنے جان اور مال سے سستی کریں، وہ سچے مؤمن نہیں، بلکہ زبانی کلامی کے مسلمان ہیں!!

أي الاعمال أفضل قال الإيمان بالله قال ثم ماذا قال الجهاد قال ثم ماذا قال حج مبرور (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

پیغمبر سے پوچھا گیا کہ یا حضرت! سب کاموں میں سے کون سا افضل ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ "سب سے بہتر اکیلے اللہ پر ایمان لانا، اس کے بعد جہاد کرنا، اس کے بعد حج مقبول کرنا ہے۔"

معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد جہاد ہی سب کاموں سے بہتر بلکہ حج سے بھی افضل ہے۔

عن أبی هريرة قال مرّ رجل من أصحاب رسول اللهﷺ بشعب فيه عيينة من ماء عذبة فأعجبته لطيبها فقال لو اعتزلت الناس فأقمت فی هذا الشعب ولن أفعل حتی استأذن رسول الله ﷺ فذكر ذلك لرسول الله ﷺ فقال لا تفعل فإن مقام أحدكم فی سبيل الله أفضل من صلاته فی بيته سبعين عاما ألا تحبون أن يغفر الله لكم ويدخلكم الجنة اغزوا فی سبيل الله من قاتل فی سبيل الله فواق ناقة وجبت له الجنة (جامع ترمذی)

"ایک پیغمبر کا یار پہاڑ کی گھاٹی میں نکلا جس میں میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا، اسے یہ مقام پسند آیا اور اس نے کہا کہ کاش میں سب آدمیوں کو چھوڑ کر، خدا کی بندگی کے لئے یہاں قیام کرلوں۔ مگر میں یہ کرنے کا نہیں جب تک حضرت حکم نہ دیں گے، پھر اس نے پیغمبر خدا سے یہ ذکر کیا، حضرت نے فرمایا: "ایسا نہ کر! بیشک اللہ کی راہ میں کھڑا ہونا یعنی جہاد کرنا، گھر میں ستر برس کی نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے اور بہشت میں لے جائے۔ لڑا کر، اللہ کی راہ میں جو لحظہ بھر لڑا تو اس کو بہشت واجب ہوگئی۔"

اس حدیث سے کئی کام کی باتیں معلوم ہوئیں: اول جو عابد، زاہد جنگل یا بستی میں گوشہ یا چلہ کئے ہوئے ہیں، ان کو لازمی ہے کہ جب کافروں سے لڑائی شروع ہو تو گوشہ رچلہ چھوڑ کر جہاد میں شامل ہو جائیں، اس واسطے کہ گوشہ گری اور عبادت کرنا صرف اللہ کی رضامندی اور ثواب کے واسطے ہے اور حضرت صاحب نے فرمایا ہے کہ "جہاد میں کھڑا ہونا ستر برس کی نماز سے بہتر ہے۔" دوسری بات یہ کہ جہاد سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، تیسری یہ کہ جو ایک لحظہ بھر لڑا، وہ ضرور بہشتی واجب ہو گیا۔

حدیث میں ایک واقعہ یوں ذکر ہوا ہے کہ "ایک شخص بڑا مالدار تھا، حضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے رسول اللہ ﷺ! مجھے وہ کام بتلایئے جس سے مجھے مجاہدوں کے برابر ثواب ملے۔ حضرت نے فرمایا: تیرے پاس کتنا مال ہے؟ اس نے کہا: چار ہزار اشرفیاں، حضرت نے فرمایا: اگر تو سب خدا کی راہ میں دے تو بھی مجاہدوں کی خوبی کی گرد کے برابر نہ پہنچے۔ اور ایک دوسرا آیا تو اس نے کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ! مجھ کو وہ کام بتلایئے جس کے سبب سے مجھے مجاہدوں کے برابر ثواب ملے، تو حضرت نے فرمایا کہ اگر تو رات بھر کھڑا ہو کر نماز پڑھا کرے اور دن بھر روزہ رکھے تو بھی ان کی نیند اور سونے کے برابر نہ سمجھا جائے" (سنن سعید بن منصور)

گرد

سبحان اللہ! جب مجاہدوں کی جوتی کی گرد اور نیند کا یہ رتبہ ہے کہ چار ہزار اشرفیاں خرچ کرنے سے اور رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر کے روزہ سے بہتر ہے تو ایک لڑائی پر عبادت کا ثواب خدا ہی جانے کہ کیا ہوگا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی مالی یا بدنی عبادت ہرگز جہاد کے برابر نہیں۔

قال رسول اللهﷺ إن ابواب الجنة تحت ظلال السيوف (صحیح مسلم)

حضرت نے فرمایا: "بلاشبہ بہشت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں۔"

قال النبیﷺ من اغبرت قدماه في سبيل الله حرم الله عليه النار

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس کے دونوں پیر اللہ کی راہ میں گرد سے بھرے تو اس پر اللہ نے دوزخ حرام کردی" (صحیح بخاری)

یعنی جس کے پیروں پر جہاد کی خاک پڑی اگرچہ وہ زخمی اور شہید نہ ہوا ہو تو بھی اس پر دوزخ کی آنچ حرام ہوگئی اور مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ

"راہِ خدا میں جس کے زخم لگے گا، حق تعالیٰ قیامت کو اسے شہیدوں پر مہر کرے گا، پھر اس پر زعفران کے مثل نور ہوگا، اور مشک کے مانند اس کی خوشبو ہوگی۔ اس زخمی کو اس مہر سے دوسرے لوگ پہچان لیں گے۔ کہیں گے: دیکھو فلاں شخص پر شہیدوں کی مہر ہے۔"

قال رسول اللہ ﷺ تکفّل اللہ لمن جاھد فی سبیلہ لا یخرجہ من بیتہ إلا جھاد فی سبیلہ وتصدیق کلمتہ بأن یدخلہ الجنۃ .....(صحیح مسلم، کتاب الامارۃ)

آنحضرت نے فرمایا: "اللہ اس شخص کو جنت میں داخلے کی ضمانت دیتا ہے جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اس کو گھر سے جہاد فی سبیل اللہ اور تصدیق کلمۃ اللہ کے سوا کسی امر نے نہیں نکالا....."

مسلمانوں کا جہاد میں کسی طرح کا نقصان نہیں، اگر مارے گئے تو بہشت ہے اگر جیتے رہے تو ثواب اور مال ہے۔

چوتھا باب..... شہادت کا ثواب اور شہیدوں کا مرتبہ

﴿وَلاَ تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلاَّ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَاَنَّ اللّٰهَ لاَ يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (سورۂ آل عمران:۱۶۹ تا ۱۷۱)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں تو مردہ نہ سمجھ، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں، خوشی کرتے ہیں اس پر جو دیا اللہ نے اپنے فضل سے، ان لوگوں کی طرف جو ابھی نہیں پہنچے اور پیچھے ہیں۔ اس واسطے کہ انہیں اس پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ غم، خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعمت سے اور فضل سے اور اس سے کہ اللہ ضائع نہیں کرتا مزدوری مؤمنوں کی"

سنن ابوداود میں روایت ہے کہ حضرت ﷺ نے صحابیوں سے فرمایا کہ

"جو تمہارے بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، ان کی روحوں کو اللہ سبز چڑیوں کے پیٹ میں رکھے، وہ بہشت میں سیر کرتے ہیں اور اس کے میوے کھاتے، پیتے اور عرش کے نیچے سونے کی قندیلوں میں آرام کرتے ہیں۔ جب یہ رتبے انہوں نے پائے تو کہنے لگے: کوئی ہماری طرف سے ہمارے مسلمان بھائیوں کو پیغام پہنچادے کہ ہم تو یہاں زندہ ہیں، بہشت میں چین کرتے ہیں تو وہ لوگ بھی دنیا کی محبت چھوڑ کر جہاد میں مستعد ہو جائیں اور سستی نہ کریں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہارا پیغام ان کے پاس پہنچادیں گے، تب یہ آیت اتاری اور شہیدوں کا مرتبہ بیان فرمایا۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شہیدوں کا مرنا، ایک طرح کی زندگی ہے۔ اور مُردوں کے خلاف

کھانا پینا اور بہشت کی خوشی اور عیش پورے ہیں اور لوگوں کو اگرچہ اولیاء ہوں قیامت کے بعد بہشت ملے گی

حضرت ﷺ نے فرمایا کہ "قیامت میں لوگ حساب دینے کو کھڑے ہوں گے تو ان کا ایک گروہ کندھوں پر خون سے ٹپکتی تلواریں رکھے، بہشت کے دروازے پر ہجوم کریں گے۔ پوچھا جائے گا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ یہ شہید ہیں، اسی لئے زندہ تھے۔" (طبرانی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شہیدوں پر حساب نہیں ہوگا۔ قیامت میں سب لوگ اپنے حال میں گرفتار ہوں گے جبکہ شہید بڑی شان سے بے خوف تلواریں لئے سیر کرتے پھریں گے۔

قال النبی ﷺ یشفع الشهید فی سبعین من بیته (سنن ابوداود)

حضرت نے فرمایا کہ "شہید اپنے گھر کے ستر افراد کو بخشوادے گا۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص جہاد کا ارادہ کرے، اس کے ماں، باپ، بیوی، لڑکوں کے حق میں بہتر ہے کہ اس کو نہ روکیں۔ اس لئے کہ اگر جیتا رہا تو پھر ان کے گھر میں رہا اور اگر شہید ہوا تو ان سب کو بخشوائے اور عذاب دوزخ سے بچائے گا اور گھر میں پڑا رہا تو آخر ایک دن مر جائے گا، پھر یہ رتبہ اس کو اور ان کو کاہے کو ملے گا۔

قال النبی ﷺ إن للشهید عند الله ست خصال یغفر له فی أول دفعة ویُری مقعدُه من الجنة ویجار من عذاب القبر ویأمن من الفزع الأكبر ویوضع علی راسه تاج الوقار الیاقوتة منها خیر من الدنیا وما فیها ویزوج اثنتین وسبعین زوجة من الحور العین ویشفع فی سبعین من أقاربه

"شہید کو اوّل یہ کہ پہلی بار کے ہوئے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ اپنا بہشت کا مکان دیکھ لیتا ہے، تیسرے یہ کہ عذاب قبر سے پناہ میں ہوتا ہے، چوتھے یہ کہ قیامت کے بڑے خوف سے نڈر ہوگا اور اس کے سر پر عزت کی تاج رکھا جائے گا، جس کا ایک یاقوت دنیا بھر کی قیمت سے بہتر ہے۔ پانچویں یہ کہ اس کے نکاح میں بہتر حوریں بڑی آنکھوں والی ہوں گی، چھٹے یہ کہ اپنی برادری کے ستر آدمی بخشوادے گا۔" (جامع ترمذی، کتاب فضائل الجہاد)

عن أبی هریرة أن رسول الله ﷺ قال الشهید لا یجد من القتال الا كما یجد أحدكم القرصة یُقرصها (سنن نسائی)

حضرت ﷺ نے فرمایا کہ "شہید قتل ہونے کی کچھ تکلیف نہیں پاتا مگر جیسا کہ تم کو چیونٹی کاٹتی ہے۔" ..... شہیدوں کے جو مرتبے بہشت میں ہیں سو بے شمار ہیں۔ یہ عجب اللہ کا احسان ہے کہ ان کو شہادت کے وقت بھی کچھ تکلیف نہیں ہوگی۔

پانچواں باب..... جہاد میں مال خرچنے کا ثواب

﴿ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ (سورۂ توبہ:۱۲۱)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور نہیں خرچ کرتے تھوڑا یا زیادہ اور نہیں گزرتے کوئی میدان مگر لکھا جاتا ہے، ان کے واسطے کہ بدلہ دے اللہ ان کو بہتر کاموں کا جو کرتے تھے"

یعنی جو کچھ مال جہاد میں خرچ ہوتا ہے تھوڑا یا بہت اور جس میدان میں کہ غازی لوگ چلتے ہیں ان سب کو فرشتے لکھ لے جاتے ہیں، حق تعالیٰ اس کا بہتر ثواب دے گا۔

﴿ وَمَالَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾

"اور تم کو کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کرو گے اور اللہ ہی کو زمین اور آسمان کی میراث ہے۔" (الحدید:۱۰)

یعنی حقیقت میں ہر چیز کا مالک اللہ ہے لیکن ظاہری طور پر تھوڑے دن کے لئے تم کو مالک مال کا بنایا ہے۔ اگر آج زندگی میں اپنی خوشی سے مال کو راہِ خدا میں نہ خرچو گے تو آخر ایک دن اس کو چھوڑ کر مر جاؤ گے، پھر یہی مال اللہ کا ہوگا، مگر افسوس کہ تم اس ثواب سے محروم رہے، جیسے خزانے کا سانپ!

أن النبی ﷺ قال من لم یغز أو یجهز غازیا أو یخلف غازیا من أهله بخیر أصابه الله بقارعة قبل یوم القیمة (سنن دارمی، کتاب الجهاد)

حضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص نہ لڑا، نہ اس نے غازی کا سامان درست کیا اور غازی کے پیچھے نہ اس کے گھر کی اچھی طرح خبر لی تو اس پر اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے پہلے عذاب ڈالے گا"

مرنے کے بعد قیامت میں عذاب ہوتا ہے لیکن جہاد میں نہ جانا اور نہ غازی کا سامان کرنا اور نہ اس کے گھر کی خبر گیری کرنا..... یہ سخت گناہ ہے اور قیامت سے پہلے اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔

قال رسول الله ﷺ من أرسل بنفقة فی سبیل الله وأقام فی بیته لله بكل درهم سبع مأة درهم ومن غزا بنفسه فی سبیل الله وأنفق فی وجه ذلك فله بكل درهم سبع مأة ألف درهم ثم تلا هذه الآیة ﴿وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾

حضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے اللہ کی راہ میں خرچ بھیجا اور اپنے گھر میں رہا تو اس کو ایک درہم کے بدلے سات سو درہم کا ثواب ملے گا اور جو خود اللہ کی راہ میں جا کر لڑا اور اپنے اوپر اس کو خرچ کیا تو اس کو ایک درہم کے بدلے سات ہزار درہم کا ثواب ملے گا۔ پھر حضرت نے اپنی بات کی تائید میں یہ آیت پڑھی کہ اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے جہاد کے ثواب۔" (ابن ماجہ، جہاد)

اور نیک کاموں میں خرچ کرنے سے ایک کے دس ملیں اور جہاد میں خرچ کرنا سب کاموں سے افضل کہ ایک کے سات سو ہوتے ہیں۔ ایسا نفع کسی سوداگری میں نہیں! زہے قسمت اس مسلمان مال دار کی جو ایسے راہ میں مال کو خرچ کرے اور بڑا کم بخت اور بے نصیب ہے کہ جو اپنے پیغمبر کی یہ حدیث سنے اور مال دار ہونے کے باوجود اس کی راہ میں نہ خرچے۔ اور معلوم ہونا چاہئے کہ جہاد میں مال خرچنا کئی طرح سے ہوتا ہے یعنی اپنی ذات اور اپنے گھوڑے پر خرچ کرنا یا جو غازی جہاد کو جاتے ہیں، ان کو کپڑے بنا دینا، ہتھیار دینا، سواری دینا اور کچھ سامانِ سفر بنا دینا، راہ کا خرچ کچھ نقد حوالے کرنا، یہ سب کام فی سبیل اللہ ان سب کاموں میں ایک کے بدلے اللہ سات سو کا ثواب دیتا ہے۔

چھٹا باب..... غازیوں کی مدد اور خدمت گزاری

قال رسول الله ﷺ من أعان مجاهداً فی سبیل الله أو غارما فی أسرته

أو مكاتبا في رقبته أظله الله في ظله يوم لاظل إلا ظله (مسند احمد، مسند مکیین)

حضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص جہاد کرنے والوں کا کام کرے،..... اسے اللہ اپنے سایہ میں رکھے گا، جس دن کوئی سایہ نہ ہوگا، سوائے خدا کے سایہ کے"

یعنی روزِ قیامت کوئی سایہ نہ ہوگا، آفتاب سر پر آجائے گا، گرمی کی شدت کی وجہ سے سارے سروں کے بھیجے اُبلنے لگیں گے۔ ایسی سختی میں غازیوں کی خدمت کرنے والے، سایہ خدا میں ہوں گے اور کتاب شفاء الصدور میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ﷺ نے یوں فرمایا کہ جو "غازیوں کو کھانا کھلائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے واسطے اتنا بڑا دستر خوان بچھادے گا کہ جس سے تمام جن اور آدمی آسودہ ہو جائیں گے اور جو غازیوں کو پانی پلائے گا، اس کو اللہ تعالیٰ بہشت میں نہر دے گا، جس کا پاٹ مشرق اور مغرب کے برابر اور اس کے کناروں پر، سونے کے بنگلے، جن میں حوریں رہیں گی اور جو غازیوں کو خرچ دے گا اور اس کی میزبانی کرے گا، وہ ایسے گناہ سے پاک ہوگا جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے"

شفاء الصدور میں یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا "جو جہاد کے واسطے تلوار دے گا تو قیامت کے دن، اس کی زبان ہوگی اور وہ کہے گی کہ میں فلاں کی تلوار ہوں، ہمیشہ اس کے واسطے جہاد کرتی رہی۔ اور جو شخص راہِ خدا میں کپڑا دے گا تو اس کو بہشت کا کپڑا ملے گا"

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یوں روایت ہے کہ "میرے نزدیک حج کرنے سے جہاد میں ایک گھوڑا دینا افضل ہے"

اور حضرت کعب الاحبارؒ سے روایت ہے کہ "جو چیز راہِ خدا میں دے، اسے کم نہ جانے کہ ایک شخص کو مجاہد کو سوئی دینے سے بہشت ملے"

اب مسلمانوں پر لازم ہے کہ جہاد والوں کی خدمت کریں، بڑا آدمی اپنی طاقت کے مطابق، غریب اپنی مقدور کے موافق، غرض کہ جس سے جو ہو سکے سو کرے کہ ان دونوں میں بہشت مفت ہاتھ لگتی ہے۔

خاتمہ..... جہاد کے رغبت دلانے کا ثواب

قال رسول الله ﷺ يدخل الجنة والناس في شدة الحساب من أمرنا بالجهاد و حرّض عليه (شفاء الصدور)

حضرت ﷺ نے فرمایا کہ "وہ شخص پہلے بہشت میں داخل ہوگا، حالانکہ لوگ حساب کی شدت میں ہوں گے، جس نے لوگوں کو جہاد کرنے کا حکم دیا اور رغبت دلائی"

سبحان اللہ! جہاد کا کیا مرتبہ ہے جو اس کا لوگوں کو شوق دلائے گا اس کو بھی بلا حساب بہشت ملے گی۔

عن علي قال من حرض أخاه على الجهاد كان مثل أجره وكان بكل خطوة خطوها في ذلك عبادة سنة (شفاء الصدور)

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "جو اپنے مسلمان بھائی کو جہاد کا شوق دلائے گا، اس کو مجاہد کے برابر حصہ ملے گا اور جتنی دور جہاد کا شوق دلانے کے لئے سفر کرے گا تو ہر ہر قدم پر ایک ایک برس کی عبادت کا ثواب پائے گا۔"

اے مسلمانو! جب تم نے ترغیب جہاد کے ثواب سنے تو جس کے پاس یہ رسالہ پہنچے، اس پر ضروری ہے کہ اس کو دیگر مسلمانوں کے سامنے پڑھے اور اچھی طرح اس کا مطلب بیان کرے اور اس کی بہت نقلیں تیار کر کے جابجا شہر بشہر روانہ کرے اور اسے مشہور کرے۔ جتنے مسلمان اس کو سن کر جہاد پر مستعد اور تیار ہوں گے، ان کے برابر اللہ تعالیٰ بتلانے والے کو بھی ایسا ثواب عطا کرے گا، جس کی حد کی انتہا نہیں..... آمین یارب العالمین!

درٹونک ساحل تالاب بعد قمر..... شہر ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری (۱۸۲۸ء)

(اگلے دو صفحات پر "تعقبات" کے عنوان سے فضیلت جہاد پر عربی اور فارسی زبان میں لکھا گیا ہے)

..... ہر ماہ "محدث" حاصل کرنے کے طریقے .....

ہمارے بہت سے کرم فرما محدث کا مطالعہ باقاعدگی سے کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس کے حصول کے بارے میں اکثر استفسار کرتے رہتے ہیں..... یہاں ہم محدث کی وصولی کے چند سادہ طریقے لکھے دیتے ہیں :

☆ محدث کی زیادہ تقسیم بذریعہ ڈاک ہوتی ہے۔ اپنے ڈاک خانے میں جا کر ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر بنام ماہنامہ محدث ۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ارسال کریں، آپ کو سال بھر محدث گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔

☆ اگر آپ ڈاکخانے جانے کی فرصت نہیں تو فون 852897, 5866396, 5866476 پر (شفیق کوکب یا ظفر صاحب کو) اپنا نام و مکمل پتہ لکھوا کر VP طلب کر لیں۔ لاہور سے باہر کے رہائشی صرف ایک خط کے ذریعے اپنا تقاضا بھیج سکتے ہیں۔ اس صورت میں آئندہ شمارہ آپ کے دیئے پتہ پر مل جائے گا اور ڈاکیہ از خود آپ سے ۱۶۰ روپے طلب کر لے گا۔ بعض اوقات ڈاکیہ انتظار نہیں کرتا یا فوری طور پر ۱۶۰ روپے کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے VP واپس دفتر محدث کو چلی جاتی ہے، جس سے ادارہ کو ۱۰ روپے بلاوجہ ادا کرنے پڑتے ہیں، اس لئے VP کے بجائے منی آرڈر زیادہ بہتر ہے، تاہم مجبوری VP منگوانے کی صورت میں اسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی اور دینی فریضہ ہے۔

☆ وہ حضرات جو محدث کا مطالعہ شروع کرنا چاہیں یا آپ اپنے بعض احباب کو محدث سے متعارف کرانا چاہیں تو خط پر مکمل نام پتہ لکھ کر نمونہ کا پرچہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ ۵ خریدار بنانے کی صورت میں آپ کو محدث مفت ارسال کیا جائے گا۔

☆ محدث صرف چند بک سٹالوں پر دستیاب ہے۔ ان دنوں مختلف بک سٹالوں پر محدث مہیا کرنے کی مہم شروع کی گئی ہے۔ بکسٹال کو محدث حاصل کرنے پر ۳۳% رعایت دی جاتی ہے، اپنے قریبی بکسٹال والے کو آپ توجہ دلا کر ہمیں اس سے رابطہ کرنے کی ہدایت کریں تاکہ آپ کے علاقے میں بھی اس کا حلقہ قارئین بڑھ سکے۔

☆ خط و کتابت کرتے ہوئے مینیجر ماہنامہ محدث کو اپنے حوالہ نمبر (خریداری، اعزازی یا تبادلہ نمبر) کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ محدث کو صرف اپنے تک نہ رکھئے، اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعہ کی ترغیب دیں، اس سے اُن کے دینی علم اور فکری نشوونما میں اضافہ ہوگا۔ محدث کا مطالعہ کرنے والے کے ثواب میں بھی آپ برابر کے شریک ہوں گے۔

☆ محدث نہ ملنے کی صورت میں فون پر یا خط کے ذریعے دفتر کو ضرور مطلع کریں تاکہ آپ کو دوسری کاپی بھجوائی جا سکے۔

☆ بیرونِ پاکستان سے محدث منگوانے کی صورت میں ۱۰ تا ۲۰ امریکی ڈالر سالانہ درج ذیل اکاؤنٹ میں بھجوائیں:

Monthly MUHADDIS A/c No: 984 UBL - Model Town Crossing, Lahore

☆ محدث پاکستان کے مقتدر طبقوں، اہل فکر و دانش، درسگاہوں اور لائبریریوں میں اعزازی طور پر بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس علمی جہاد میں شرکت کے لئے آپ ۵ یا ۱۰ حضرات کو اپنے خرچے پر بھی محدث بھیج سکتے ہیں۔ یہ علم و تحقیق کے فروغ اور راست فکر دینی رہنمائی کی اشاعت میں آپ کا حصہ ہوگا۔ (محمد شفیق کوکب، مینیجر ماہنامہ محدث، لاہور)

اسلام اور سائنس

حافظ حسن مدنی
مدیر معاون

کمپیوٹر اور علم و تحقیق کے بدلتے رُجحانات

محدث کے گذشتہ شماروں میں راقم نے کمپیوٹر کے حوالے سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کے بارے میں قارئین سے آراء طلب کی گئی تھیں کہ آیا اِن مخصوص نوعیت کے مضامین کو جاری رکھا جائے یا نہیں۔ یہ امر میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ صرف دو مضامین کی اشاعت پر جس کثرت سے قارئین نے اپنا ردِّ عمل ریکارڈ کروایا، اس سے قارئین کی اس موضوع سے دلچسپی کھل کر سامنے آگئی۔ مختلف علمی و تحقیقی اداروں سے ان شمارہ جات کی اس قدر زیادہ طلب رہی کہ اب یہ شمارے ادارہ کے ریکارڈ میں بھی تقریباً ناپید ہو چکے ہیں۔ بہر حال یہ ہمارے قارئین کی علم دوستی اور اس رجحان کی ایک طرح ترجمانی ہے کہ اسلام اور علم و تحقیق سے وابستہ حضرات ایسے موضوعات سے غافل نہیں بلکہ وہ کچھ جاننا چاہتے اور ان جدید وسائل علم سے استفادہ کرنے کے شدید خواہش مند ہیں۔

جہاں تک میری ذاتی دلچسپی کا تعلق ہے تو یہ امر میرے لئے کوئی خوش آئند نہیں کہ دینی تعلیم کے حصول کے بعد میری علمی و تحریری کاوشوں کا محور صرف کمپیوٹر بن کر رہ جائے لیکن فی زمانہ اس کی اہمیت اور اپنے قارئین کو اس سے متعارف کرانے کی خاطر میں آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کسی وقت قارئین مجھے کسی افراط و تفریط پر مائل محسوس کریں تو ان کے ردِّ عمل اور مشوروں کو خوش آمدید کہوں گا۔ اللہ ہماری نیتوں کو خالص رکھے، آمین!

یہ بات بھی بخوبی میرے علم میں ہے کہ بعض قارئین کے لئے یہ ساری گفتگو ایک بیکار اور 'غیر اسلامی' سرگرمیوں سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور شاید کہ وہ مسلسل اس موضوع کو محدث کے اوراق میں جگہ دینے پر کبیدہ خاطر بھی ہوں۔ ان سے معذرت کے ساتھ عرض پرداز ہوں کہ اس زمانہ میں کسی کے لئے بھی اب کمپیوٹر سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں رہ گیا۔ جس طرح کاغذ کی ایجاد سے علم کی دنیا میں عظیم انقلاب رونما ہوا اور علم کو پھلنے پھولنے کے بے شمار مواقع میسر آئے، اسی طرح صدیوں کے بعد کمپیوٹر کی صورت میں ایک عظیم تر وسیلہ، علم و تحقیق کے لئے دستیاب ہوا ہے علم کو کثیر سہولتوں والا ایک پیراہن نصیب ہوا ہے..... اگر ان مضامین سے گنتی کے چند اہل علم ان جدید علمی وسائل کو استعمال کرنے کے قائل ہو جائیں تو میں اسے بڑی کامیابی اور پیش رفت سمجھوں گا۔ (حسن مدنی)

کمپیوٹر کی قیمتوں میں حیرت انگیز کمی اور اس کے استعمال کا بڑھتا رجحان

ایک ماہ قبل جولائی ۹۹ء میں مجھے کمپیوٹر مارکیٹ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں تازہ ترین قیمتوں کا جائزہ لینے کا موقعہ میسر آیا۔ صرف قیمتوں کے اس جائزے نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

دنیا بھر میں گرانی جس طرح روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، عجب حقیقت ہے کہ الیکٹرونکس بالخصوص آلات کمپیوٹر کی قیمتیں روز بروز ناقابل یقین حد تک گرتی جا رہی ہیں۔ اس کی بنیادی وجوہات میں، عالمی طور پر اس ٹیکنالوجی سے استفادہ کی ترغیب، صارفین کی روز افزوں کثرت اور جدید ترین

ٹیکنالوجی کی معرفت اور کمپیوٹر بنانے والی کمپنیوں میں شدید مقابلے کی فضا وغیرہ شامل ہیں۔ یوں تو قیمتوں میں کمی کا رجحان میرے علم میں تھا ہی لیکن گذشتہ چند ماہ میں گرنے والی قیمتوں کے بارے میں یہ جان کر میں ششدر رہ گیا کہ چند سالوں سے تواتر سے کمپیوٹر کی جو اوسط قیمت ۳۰ ہزار روپے کے لگ بھگ چل رہی تھی اب ۱۵ سے ۱۸ ہزار روپے تک آچکی ہے۔ یہ اطلاع ایک طرف میرے لئے خوش آئند تھی لیکن دوسری طرف تفکر آمیز بھی، کیونکہ اس سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہ تھا کہ دنیا بھر میں کمپیوٹر کا استعمال اور دائرہ کار کس کثرت سے پھیل چکا ہے اور ان قیمتوں میں نمایاں کمی کے بعد کس قدر حیرتناک طریقے سے مزید پھیلنے کے واضح امکانات ہیں۔ مجھے پریشان کرنے کو ایک مزید نکتہ یہ بھی تھا کہ پاکستان کی کرنسی کی عالمی حیثیت کے پس منظر میں، درآمد و برآمد کے پر پیچ نظام میں جکڑے ہوئے ملک ہونے کی حیثیت سے اور جن ممالک میں یہ ٹیکنالوجی خود بن (Manufactur) رہی ہے انہیں اپنی مضبوط کرنسی میں اس کی کتنی معمولی قیمت ادا کرنا ہوتی ہوگی۔

آج کے دور میں غیر ممالک میں کمپیوٹر خریدنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے پاکستان میں ٹیپ ریکارڈر کی خریداری۔ قیمتوں کے اس ہوشربا تفاوت کو سامنے رکھیں تو بیرونی دنیا کے بالمقابل پاکستان میں اس حیران کن ایجاد سے استفادے کے امکانات بھی بہت محدود اور مختلف نظر آتے ہیں۔ اشیاء کی گرانی ان کے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے ☆۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ کمپیوٹر صرف ایک سائنسی ایجاد نہیں بلکہ جس طرح کاغذ کی ایجاد نے مجموعی طور پر بیسیوں حوالوں سے حیات انسانی کو

☆ یہاں میں عرب ممالک کے متعدد سفروں کے دوران اپنے مشاہدے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ عرب ممالک بالخصوص مالدار خلیجی ممالک میں مجھے ہر گھر میں کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ دینی نوعیت کے پروگرام بھی بڑی تعداد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا..... جہاں تک پاکستانی قوم کی سائنسی اور تکنیکی صلاحیت اور کمپیوٹر کے پاکستان میں عام ہونے کا تعلق ہے تو عرب ممالک کا پاکستان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ اُن کے ہاں ابھی تک کمپیوٹر سے نجی بنیادوں پر کوئی سنجیدہ کام نہیں لیا جارہا اور نہ ہی اس کی کوئی مہارت وہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جبکہ پاکستانی قوم اپنے مخصوص ماحول کی وجہ سے ٹیکنیکل صلاحیت اور کمپیوٹر کے میدان میں انفرادی سطح پر دوسری بہت سی قوموں حتیٰ کہ یورپی ممالک سے بھی آگے ہے۔

ہمارے دیندار طبقے کی طرح وہاں بھی اس حوالے سے کمپیوٹر کے استعمال کا کوئی خاص ذوق نہیں ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس کثرت سے ایسے گھروں میں کمپیوٹر اور اسلامی تحقیقی پروگراموں کی موجودگی دیکھنے کا جو موقعہ ملا ہے اس کی بنیادی وجہ ان کے کمپیوٹر کی ارزانی ہے۔ ایک ماہ کی آمدنی سے وہ کمپیوٹر خرید سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک معروف حقیقت ہے کہ مصنوعات کی زیادہ ورائٹی بھی انہی بازاروں میں ہوتی ہے جہاں کے خریداروں کی قوتِ خرید بہتر ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں بچے کھچے کمپیوٹر پروگرام ہی بڑی دیر کے بعد پہنچتے ہیں۔

انہی دنوں اس موضوع پر لکھنے سے قبل ان موضوعات پر کچھ لٹریچر دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے عربی میں ہی کتب میسر آسکتی تھیں۔ بڑی دردسری سے اس موضوع پر ملنے والی تازہ ترین عربی کتابوں میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بعض بڑی بنیادی نوعیت کی معلومات اور کچھ اعداد و شمار کے علاوہ ان میں کوئی نئی تحقیق یا معلومات موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح انگریزی کتب میں بھی ہمارے مخصوص موضوع پر کچھ نہیں مل سکا۔

نئی جہت عطا کی تھی، اسی طرح کمپیوٹر کا کاغذ سے بڑھ کر ہر شعبۂ زندگی میں وسیع اور ناگزیر استعمال مجموعی قومی کارکردگی میں واضح اضافے کا ضامن ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی گہری نظر سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کسی لمبے چوڑے اعداد و شمار کی کوئی ضرورت نہیں۔ ذیل میں ہمارے مخصوص موضوع کے حوالے سے کمپیوٹر کی کارکردگی کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ میں اس امر پر متفکر ہوں کہ مختلف میدانوں میں اپنے ہم عصروں سے پیچھے ہونے کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی کرنسی کی کم مائیگی کی بنا پر اس شعبے میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں تو ہماری قومی کارکردگی اس سے ضرور متاثر ہوگی۔ بہر حال اگر ہم اس کی اہمیت سے آشنا ہو جائیں تو کسی طرح بھی ان روبہ تنزل ہونے والی قیمتوں سے فائدہ اٹھا کر یہ جدید وسائل علم حاصل کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے ذمہ دار افراد ہونے کے ناطے ہمیں یہ غور و فکر کرنا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہمیں اپنی ملت میں کن رجحانات کی آبیاری کرنا ہے۔ ایسے رویوں کی تعمیر کے لئے سنجیدہ غور و فکر اور منصوبہ بندی کرنی ہے تاکہ آئندہ صدی ہمارے لئے کامیابی کا پیغام بن کر آئے۔ یوں تو قوموں کے عروج و زوال میں سائنس و ٹیکنالوجی سے بہت زیادہ ان عناصر ترکیبی اور جذبہ ایمانی و قومی کا دخل ہوتا ہے جو ان کے فکر و نظریے میں نقش ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر عناصر کو نظر انداز کرنا بھی عقل مندی نہیں ہوگی۔

ملتِ اسلامیہ کے مذہبی و دینی قوتوں کو عصری تقاضوں کے پیش نظر اپنی اپنی ابلاغی حکمتِ عملی میں جن تبدیلیوں کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے، ان میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف مثبت میلان اور قومی رجحان کی آبیاری نہایت اہم ہے۔ ٹیکنالوجی فی نفسہٖ منفی یا مثبت قدروں کی حامل نہیں ہوتی، اس کا استعمال البتہ اس کی حیثیت کا تعین ضرور کرتا ہے۔ امتِ مسلمہ کو اپنی کھوئی ہوئی علمی میراث کی بازیابی کے لیے دورِ جدید کی ایجادات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال میں لانا چاہیے۔

جس طرح دورِ جدید میں ملتِ کفریہ سے جہاد کے لیے جدید اسلحہ کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے، اسی طرح اسلام اور مغرب کے درمیان علمی و تہذیبی کشمکش کے فیصلہ کن معرکہ میں فتح و کامرانی کے لیے کمپیوٹر جیسی مفید ایجاد کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے عالمی، علاقائی اور مقامی ثقافتوں کے خدوخال اور نقوش کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں میں ٹرانسپورٹ، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور برقی آلات نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی چند دہائیوں میں کمپیوٹر کے انسانی معاشرت پر اثرات ایک نوشتہ دیوار حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ مذہبی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور تبلیغی و فروغ کے لیے کمپیوٹر کے استعمالات کے فوائد کا ادراک کرنا اور ذہنی طور پر اس معجزاتی ایجاد کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں

داخل کرنا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کو اس وقت جن اُمور کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لئے جن خطوط کی نشاندہی کرنا ہے، وہ سب غور و فکر، تحقیق و جستجو، تجزیہ و تبصرہ کے بعد اعلیٰ انسانی سوچ بچار کے بغیر پورے ہونے ناممکن ہیں۔ آئندہ منصوبہ سازی اور تشکیل نو کے لئے "ریسرچ" ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک عالمی جائزے کے مطابق دنیا بھر میں ہونے والی تمام تحقیق میں مسلمانوں کا حصہ فی زمانہ صرف ۳ فیصد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں دروغ گوئی کا عنصر بھی شامل ہو لیکن بحیثیت مجموعی ملت اسلامیہ میں علمی و تحقیقی رجحان تقریباً ناپید ہے۔ اسلام جیسے عظیم الشان نظریۂ حیات کی تشریح و ترجمانی کے لئے جو تمام دنیا کے لئے راہِ ہدایت بن کر آیا ہے، اس کے پیروکاروں کی کاوشیں ایک مخصوص دائرہ تک محدود ہیں۔ ان کے فکری و عقلی تانے بانے بعض بڑے جزوی مسائل پر صدیوں سے اُلجھے چلے آرہے ہیں۔ اسلام کی حامل قوم ہونے اور نبی آخر الزمان ﷺ کے علمی دینی وارث ہونے کے ناطے جس علم دوستی اور عالمی ذمہ داری کا احساس ہمارے لئے ضروری تھا آج وہ تقریباً مفقود نظر آتا ہے۔

جدید دنیا حقائق، اعداد و شمار، ترتیب و سلیقہ اور عقل و منطق کے اسلوب میں ڈھلی بات سمجھتی ہے۔ دم توڑتی رواں صدی میں علوم کے جن نئے دھاروں کی راہیں کھلی ہیں اور انسان کو جن فکری، معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نظریات سے واسطہ پڑا ہے، وہ اسلام کے نام لیواؤں سے بھی بہت محنت کا تقاضا کرتے ہیں لیکن افسوس کہ ہنوز ہُو کا عالم طاری ہے۔ صرف دو صدیوں قبل تک مسلم اُمہ میں جو عظیم الشان علمی مزاج اور تحقیقی کام ہوتا رہا ہے بلکہ برصغیر میں ایک صدی قبل علماء نے جو علمی پہاڑ سر کئے، آج ان کی مثال بھی نہیں ملتی۔

جدید دنیا ازموں (ISMS) کی دنیا ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے علمی شعور سے مالیاتی نظام، معاشرتی و خاندانی نظام کے مربوط خاکے، دوٹوک نظریے اور نکتہ وار اَحکامات مانگتی ہے۔ یوں تو اسلام میں نظاموں کی یہ موجودہ مصنوعی تقسیم نہیں ہے بلکہ ایک فطری رنگ میں زندگی گزارنے کا مکمل لائحہ عمل دیا گیا ہے، جس کا ایک ایک حکم متعدد خاکہ ہائے نظام میں فٹ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کوئی شرعی تقاضا نہیں ہے لیکن امورِ حیات کو منضبط کرنے کے اس جدید اُسلوب کی ایسی نفی بھی اسلام میں نہیں ملتی۔ آج جبکہ فلاحِ انسانی کا دعویدار ہر نظریہ حیات اس رنگ میں بات کر رہا ہے تو امت کے علمی شعور کو بھی اس عالمی ڈائیلاگ میں بھرپور شرکت کر کے اسلامی نظریہ زندگی اُجاگر کرنے پر توجہ دینی چاہئے۔

ہمارے روایتی دینی لٹریچر میں بھی دینی احکام کی اس طرح کی تقسیم بندی موجود ہے جس میں اسلام کا نظامِ طہارت، نظامِ قضاء اور فلسفۂ عدل وغیرہ ایسے بیسیوں موضوعات کے اعتبار سے احادیث کو جدا کیا گیا ہے، فقہی ابواب بندی بھی کی گئی ہے۔ لیکن موجودہ دور کی اشاریہ بندی اور موضوعاتی تقسیم کے تحت احکام کے اندراج وغیرہ کے کام میں جو فائدہ کمپیوٹر سے اُٹھایا جاسکتا ہے وہ کسی اور چیز سے ممکن

نہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں اسلامی حوالے سے کمپیوٹر پر جو کام سامنے آیا ہے وہ خوش کن بھی ہے، حیرت ناک اور چشم کشا بھی۔ کمپیوٹر بڑے سے بڑے مواد کی ترتیب میں اور بر موقع اس کو پیش کرنے میں انتہائی باریک بینی سے کام لیتا ہے۔ یونہی میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ سب جدید آلات اسلامی علم و فن کی ترویج میں خوب کام آنے کے لئے عالم وجود میں آئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں اور اسلامی ذخیرۂ علم وفنون میں وہ وسعت اور جامعیت ہے جس کے ذریعے عالم گم گشتہ کو نور کی روشنی عطا کی جاسکتی ہے۔

بہر حال بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور فکر کے دھارے ایک موضوع سے دوسرے موضوع تک پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر کے حوالے سے مجھے یہ شدید احساس دامن گیر ہے کہ اگر ہمارا علم و تحقیق سے وابستہ طبقہ جدید دور کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ جدید آلاتِ تحقیق سے استفادہ نہ کرپایا تو امتِ مسلمہ کے لئے دنیا کی فکری قیادت کے تقاضے پورے کرنے مشکل ہوں گے۔

میں ایک مثال سے اپنی بات کو واضح کرتا ہوں کہ آج کے اس سائنسی دور میں جب کسی علمی مسئلے پر بحث و تحقیق کا مسلم اور غیر مسلم محقق کو برابر کی سطح پر واسطہ پیش آتا ہے تو غیر مسلم کمپیوٹر سے استفادے کی بدولت صرف چند منٹوں میں وہ بنیادی مواد جمع کر لیتا ہے جس سے اس مسئلہ کی حقیقی صورت گری ممکن ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارا محقق ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد جس میں نہ حکومتی مدد شامل ہوتی ہے نہ عوامی تائید، نہ مالی مفاد کی کوئی توقع، نہ ہی اپنی فکری کاوش کے وسیع تر ابلاغ کا کوئی واضح امکان، صرف اس قابل ہو پاتا ہے کہ بڑے محدود پیمانے پر وہ گذشتہ محققین کا کام یکجا کر سکے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے ہاں کتب کی دستیابی ایک مشکل امر ہے۔ کتب کی گرانی کے باعث وسیع ذاتی لائبریری ہر کسی کے بس میں نہیں اور پبلک لائبریریوں کا حال ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک طرف ان کی تعداد اور ان میں کتب کا شمار بہت کم ہے تو دوسری طرف ان دستیاب کتب تک رسائی کا کوئی ٹھوس نظام نہیں۔ ان سب مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد مزید محنت کی ہمت تو کچھ سر پھرے علم دوست ہی کر سکتے ہیں۔ دراصل ہر کام ایک مربوط نظام کے باعث چلتا ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق کی مشکلات کا اگر اندازہ کریں تو کوئی حیرت نہیں رہ جاتی کہ اس ضمن میں ہماری کارکردگی اس قدر کم کیوں ہے۔ کیوں کہ جن ممالک سے ہم موازنہ کرنے کی جسارت کر رہے ہیں وہاں تحریری کاوشوں کو ایک قانونی تحفظ بھی حاصل ہے۔ پوری کتاب کی طباعت تو ایک طرف رہی، صرف ایک صفحہ کی فوٹو کاپی یا کسی اقتباس کے نقل کرنے کے لئے بھی مصنف سے پیشگی اجازت لینا پڑتی ہے۔ اور ہمارے ہاں اس چیز کا کوئی تصور بھی نہیں اور معاشرہ بھی اس مشن سے وابستہ لوگوں کی قدر و قیمت سمجھنے اور عزت واحترام دینے کی بجائے انہیں خبطی اور نجانے کیا کیا سمجھا جاتا ہے۔ ان علم کش حالات میں ہمارا اور مغربی ممالک کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

بہر حال ان سب مسائل کی موجودگی میں مسلمان محقق تو صرف بحث پر اکتفا کر جاتا ہے اور کسی تخلیقی کاوش کی نوبت نہیں آپاتی۔ ہم اپنے تیار کردہ ریسرچ پیپرز دیکھیں تو اس کی صداقت میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جبکہ غیر مسلم محقق پورے حکومتی تعاون اور عوامی اعتماد کے ساتھ بحث

کے بعد تحقیق اور تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اس مسئلے کے حقیقی حل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ نتیجہ جو نکلتا ہے، اس سے ہم سب آگاہ ہیں۔ بڑے شرح صدر کے ساتھ میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اپنی ذہنی صلاحیت اور علمی استعداد کے ناطے مسلمان قوم ایک عظیم مقام رکھتی ہے۔ قرآن کے نام لیوا اور اسلامی تعلیمات کے علمبردار اولاً تو غیر مسلموں سے اس ناطے ہی واضح برتری رکھتے ہیں کہ وہ ہدایتِ الٰہی اور تعلیماتِ محمدیؐ سے بہرہ ور ہیں، دوسرے علم دوست اسلامی نظریات مسلمان قوم کی درست بنیادوں پر فکری و ذہنی نشوونما کرتے ہیں۔ لیکن واقعاتی حقائق بھی ٹھوس حقیقت رکھتے ہیں جس کو بڑے اختصار سے اوپر درج کیا گیا ہے..... کمپیوٹر سے استفادہ کرنے کی صورت میں ان مسائل میں یوں کمی ہوتی ہے:

(۱) ہر شخص اپنی ذاتی لائبریری کو بہت وسیع کر سکتا ہے۔ کیونکہ صرف ۶۰ روپے کی CD میں وہ لاکھوں صفحات خرید سکتا ہے۔

(۲) محقق بڑی محنت سے صرف اپنے شہر کی لائبریریوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ انٹرنیٹ کے ذریعے جہاں وہ لمحات میں دنیا بھر کی لائبریریوں سے مربوط ہو کر نہ صرف کتاب کا کمپیوٹر کی سکرین پر مطالعہ کر سکتا ہے بلکہ بوقتِ ضرورت اس کی گھر بیٹھے خریداری بھی کر سکتا ہے۔ اس میں وقت اور وسائل کی حیرت انگیز بچت بھی ہے۔

(۳) اوراق پر موجود کتاب کی بجائے کمپیوٹر میں موجود کتاب (Digital Publication) سے استفادہ کرنا بہت آسان اور قلیل ترین وقت کا متقاضی ہے۔ جس میں مطالعہ کرنے کے لئے متعلقہ صفحات کا پرنٹ (Print) لمحہ بھر میں لیا جا سکتا ہے۔

(۴) ہمارے ہاں کتاب کی تیاری کے بعد مصنف کو یہ مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے کہ سنجیدہ کتابوں کو پبلشر چھاپنے پر راضی نہیں ہوتے۔ کتاب کو شائقین تک پہنچانے کے لئے اُن کی منت سماجت بھی کرنا پڑتی ہے۔ جبکہ کمپیوٹر سے فائدہ اٹھانے والے حضرات چند روپوں میں ذاتی طور پر کتاب کی اشاعت (Digital Publication) کا انتظام انٹرنیٹ یا CD کے ذریعے کر سکتے ہیں۔

(۵) کاتب سے کتابت کروانا ایک دردسری سے کم نہیں۔ جن لوگوں کو اس سے واسطہ پیش آیا ہے، وہ اس صبر آزما کام سے بخوبی آگاہ ہیں۔ کمپیوٹر کے آنے کے بعد جہاں کتابت کی دلکشی اور یکسانیت میں اضافہ ہوا ہے وہاں کاتبوں کے نخروں سے بھی جان چھوٹ گئی ہے۔ اس کے علاوہ کام کی رفتار میں حیرت ناک اضافہ ہوا ہے۔ پہلے اگر کتابت پر دو ماہ صرف ہو جاتے تھے تو آج دو دن میں یہ کام بخوبی پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

(۶) ہاتھ کی کتابت میں دوسرے ایڈیشن میں اضافہ جات یا کسی بہتری، غلطی کی تصحیح، کتاب اور لکھائی کے سائز میں تبدیلی وغیرہ کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ کمپیوٹر کے آنے کے بعد اس نوعیت کی اس قدر سہولتیں میسر آگئی ہیں کہ اب ان سہولتوں کی کثرت ہی بسا اوقات کتاب کی تکمیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ان سہولتوں سے واقعتاً کام میں بہت آسانی اور خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔

(۷) کمپیوٹر سے اگر بحث و تحقیق میں مدد لی جائے تو کارکردگی میں حیرتناک اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کام جو روایتی انداز میں ہفتوں کی مدت کا متقاضی تھا، کمپیوٹر پر صرف چند گھنٹوں میں ہو سکتا ہے۔

(۸) انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جائے تو آپ کے رابطے کے جہاں اخراجات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں وہاں یہ رابطہ بھی بہت فوری بنیادوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس عظیم ترین عالمی نیٹ ورک کے ذریعے

..... تمام دنیا کے اخبارات و رسائل اور ان کے پرانے ایڈیشن لمحہ بھر میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

..... مطلوبہ موضوع پر دنیا بھر کام کرنے والے اداروں کا چند لمحات میں پتہ چلا کر ان سے فوری طور پر معلومات کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔

..... تمام متعلقہ افراد اور ماہرین سے الیکٹرانک میل (ڈاک) کے ذریعے سوالات کے جوابات اور Live Chat (فوری گفتگو) کی جاسکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر اپنی تمام تحقیق ایک لمحہ میں انہیں یا ان کی تحقیق خود وصول کی جاسکتی ہے۔

..... مختلف موضوعات پر کتب کی دستیابی اور ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں

..... دنیا بھر کی عظیم ترین لائبریریوں سے کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ

جوں جوں انسان کا دائرہ کار اور اس کی جہد و کاوش کا حلقہ وسیع ہوتا جارہا ہے توں توں نظامِ فطرت کے مطابق ایسی ہی سہولتیں بھی دریافت ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج کے پر پیچ اور وسیع المنظر مسائل سے نمٹنے کے لئے صدیوں پرانے وسائل سے کام چلانا کافی مشکل ہے۔ اس بات پر ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ اِس دور کے کثیر مسائل کے حل کے لئے اِسی دور کے وسائل سے استفادہ کر کے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

میں اپنے پچھلے مضامین میں لکھ چکا ہوں کہ آئندہ دور جمع و ترتیب کا نہیں، تجزیہ و تخلیق کا ہے۔ اگر ہمارے محققین اس جمع و ترتیب کی ڈگر پر چلتے رہے تو کبھی زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ اس واقع ہونے والے عظیم انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے خصوصیت سے توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔

یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کمپیوٹر یہ سب کام از خود نہیں کرتا۔ اگر ہمارے اہل علم کمپیوٹر پر اپنی کوئی کتاب نہیں پیش کرتے، کوئی تحقیق نہیں داخل کرتے، اس پر اپنے رابطہ یا اپنے اداروں کے رابطے نہیں حاصل کرتے، انٹرنیٹ پر اپنی نمائندگی نہیں دیتے تو کیونکر ممکن ہے کہ کمپیوٹر از خود ان کے بارے میں کوئی اطلاع دے سکے۔ اگر ہم مجموعی طور پر اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے آج میدانِ عمل میں آئیں گے تو تب یہ تمام سہولتیں ہمیں اور اہل علم کے ہمارے عالمی حلقے کو حاصل ہوں گی۔

اوپر درج ہونے والی ان تمام سہولیات سے اس وقت عالم کفر مسلسل فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہمارے بعض لوگ اگر اس میدان میں اُترتے بھی ہیں تو یہ شکوہ کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ انٹرنیٹ پر ہمارے

مخصوص ذوق کے نہ روابط موجود ہیں نہ کمپیوٹر پروگرام۔ لیکن انہیں سمجھنا چاہئے کہ ان سے دوسروں کو بھی یہی شکوہ ہے کہ ان کا انٹرنیٹ پر کوئی رابطہ موجود نہیں ہے۔ اوّل تو کمپیوٹر پر اسلامی حوالے سے میسر سہولیات کوئی کم بھی نہیں ہیں بلکہ زیادہ مسئلہ لاعلمی اور کم توجہی کا ہے۔ ثانیاً اگر یہ مسئلہ موجود بھی ہے تو مسئلہ کا خاتمہ اس کو ختم کرنے سے ہوگا۔ ہمیں اپنے حصے کا کام بجالانا چاہیے اور اس عالمی نیٹ ورک کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ ورنہ آج سے ۱۰ برس بعد بھی ہم اسی مقام پر کھڑے ہوں گے اور باقی تمام دنیا ان وسائل سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہی ہوگی۔ آج اگر ہر دسواں اسلامی ادارہ اپنا انٹرنیٹ چینل بنانے کا عزم کرلے جس کی کوئی زیادہ لاگت بھی نہیں ہے تو چند ماہ کے قلیل عرصے میں یہ روایت چل پڑے گی۔ اور عنقریب اسلامی اداروں کا ایک عظیم الشان نیٹ ورک انٹرنیٹ پر موجود ہوگا اور ان وسائل سے جہاں خود خوب خوب استفادہ کرے گا وہاں اس کی اثر انگیزی اور اپنے مشن کی تبلیغ کے بھی حیرت ناک مواقع پیدا ہو جائیں گے۔

انٹرنیٹ پر اپنی نمائندگی پیش کرنے کے علاوہ ہمیں کاغذ کے ساتھ ساتھ پردۂ سکرین پر بھی اشاعت و تبلیغ کا آغاز کرنا چاہئے۔ میں نے CD کے حوالے سے جن کتب کی موجودگی کا گذشتہ مضمون میں تذکرہ کیا ہے، ان میں مزید کتب کے اضافے کے لئے CD میں داخل کرنے کے کام میں بھی دینی اداروں کو شرکت کرنی چاہئے۔ ایک تو کتب کی صورت میں اشاعت کے بعد اس کو صرف معمولی سی اضافی محنت سے CD پر بھی منتقل کروایا جائے۔ علاوہ ازیں پہلے سے موجود شدہ لٹریچر کی ترتیب و اشاریہ بندی (Indexing) کرکے انہیں بھی کمپیوٹر پر پیش کیا جائے۔ ہمارے علمی سرمائے میں جمع و ترتیب کے حوالے سے پہلے ہی بے شمار کام کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ان کتب سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذخیرۂ علمی کو کمپیوٹر کمپنیوں کے ذریعے ترتیب دلوایا جائے۔ بعد ازاں دوسرے غیر مرتب موضوع کی ترتیب و اشاریہ بندی کا کام ہنگامی سطح پر کیا جائے۔ اور یہ کام کمپیوٹر کمپنیوں کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس سے استفادہ کرنے کا مکمل نظام وضع کرکے دے سکیں۔ یوں تو یہ کام عرب ممالک میں بڑے پیمانے پر کافی برسوں سے جاری ہے۔ اس کا ثمرہ ہے کہ آج بنیادی مصادر اسلام سے چند منٹوں میں استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن ہمارا اُردو لٹریچر جو اسلام پر کام کا ایک وسیع و عظیم ذخیرہ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، اور ہمارے مخصوص رجحانات کے تحت موضوعات کی تیاری اور ترتیب بندی کا کام تو ہمیں اپنے طور پر ہی کرنا پڑے گا۔

اس سارے کام کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ ہونے کے لئے ایک مثال ہماری آنکھیں کھول دینے کو کافی ہوگی۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک نے کمپیوٹر کی مدد سے یہ حیرت انگیز کامیابی حاصل کر لی ہے کہ تحقیق کے تمام بنیادی اجزاء میں مدد مہیا کرنے والی کتب کو اشاریے بنا کر کمپیوٹرز میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی موضوع پر تحقیق کی نوبت پیش آتی ہے تو معروف اسلوبِ تحقیق کے مطابق سب سے پہلے معروف لغات سے اس کا لغوی و اصطلاحی معنی و مفہوم درج کیا جاتا ہے۔ اس موضوع کا تاریخی ارتقاء اور اس پر اس موضوع کے متخصصین (Specialists) کی آراء، بااعتماد کتب سے

حوالہ جات، مختلف اخبارات و میڈیا میں اس حوالے سے نشر ہونے والی خبریں وغیرہ، عموماً تحقیق میں اس سے ملتی جلتی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔ بعد ازاں محقق اس پر اپنا تجزیہ و تبصرہ اور نتیجہ وغیرہ شامل کرتا ہے۔ مختلف علمی آراء میں اپنے مخصوص علم و ذوق کے مطابق ترجیح دیتا اور سوالات پیش کرتا، بعض اعتراضات کو ختم کرتا ہے۔ اس سارے تحقیقی عمل کو تین مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے: ریسرچ فیلوز، ریسرچ ایسوسی ایٹس اور پروفیسرز (محققین)..... اگر آخری درجے کے کام کی بہت زیادہ اہمیت ہے تو دوسری طرف ابتدائی اعداد و شمار، اور اس موضوع پر سابقہ تحقیقات وہ فریم ورک متعین کر دیتی ہیں جس کو سامنے رکھ کے مزید کام کیا جانا چاہئے۔ محقق کے لئے ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جدید دنیا میں پہلے درجہ کی حد تک کمپیوٹر سے استفادے پر کامیابی سے عمل شروع ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر کمپیوٹر کو صرف ایک موضوع بتا دیا جائے تو وہ جملہ عناصر تحقیق سے دی گئی ہدایات کے مطابق از خود استفادہ کر لیتا ہے اور چند لمحات میں وہ ریسرچ پیپر تیار کر کے رکھ دیتا ہے، بنیادی طور پر یہ ریسرچ فیلو کے درجے کا کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر کے درجے کا کام کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ جو اس پر اپنی طرف سے تجزیہ و تبصرہ، موجودہ حالات میں اس کی صورت گری اور اپنے مخصوص معروضی جائزے کے مطابق اس کا انطباق کرتا ہے۔

الحمد للہ اسی اسلوب پر مسلمان ممالک میں بھی کمپیوٹر پر کچھ کام ہوا ہے۔ گذشتہ سال چند CD پر مشتمل بیروت سے تیار ہونے والے کمپیوٹر پروگرام میں ساٹھ ہزار فقہی موضوعات کو تیار کر دیا گیا تھا۔ یعنی اگر کوئی خواہشمند کسی فقہی مسئلہ پر اسلامی ذخیرۂ علم کھنگالنا چاہے تو صرف موضوع دے کر، اس موضوع سے متعلق تمام آیات، مفسرین کی جملہ آراء، تمام متعلقہ احادیث، احادیث پر ائمہ فن کی تخریج اور جرح و تعدیل، فقہ میں اس کے متعلق ائمہ کی آراء، ان کے دلائل اور مختلف کتب میں بکھری ایک امام کی منتشر آراء ایک مقام پر جمع کر سکتا ہے۔ یہ سارا کام صرف چند ساعتوں میں کمپیوٹر مکمل کر لیتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان معلومات کو مزید متنوع کیا جائے۔ ترتیبات میں زیادہ دقت اور عرق ریزی سے کام لیا جائے اور اسی طرز پر تمام کتب کو آہستہ آہستہ چند ایک برسوں میں کمپیوٹرائز کر دیا جائے۔

میں گذشتہ مضمون میں اس کا تفصیلی طریقہ کار لکھ چکا ہوں کہ یہ کام کمپیوٹر کیونکر کرتا ہے؟ اس مقصد کے لئے اہل علم باری باری مختلف کتب کو باریک بینی سے تجزی (ٹکڑے ٹکڑے کرنا) اور تحلیل کے مراحل سے گزارتے ہیں اور ہر قدرِ مشترک رکھنے والی چیز کو مخصوص سلسلہ وار شمار دیتے جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صفحہ کی تحلیل میں اس پر ۲۵ جداگانہ اکائیاں بنیں جن میں سے ہر ایک کسی مستقل تسلسل میں پروئی جائے۔ جز بندی یا موضوع بندی کے لئے اولاً تو اس ضرورت کے مدِ نظر لکھی جانے والی کتب سے بنیادی کام لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں اہل علم کی مختلف کمیٹیاں نئے عنوانات کی تقسیم بندی کر دیتی ہیں۔ درحقیقت یہ کام مشکل اور دقیق ہونے سے زیادہ وسعت کا متقاضی ہے۔ کوئی بھی درمیانے درجے کا صاحب علم کچھ عرصہ کی مہارت کے بعد یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کا

کام وہاں شروع ہوتا ہے جب ایک موضوع کے تحت لاکھوں اندراجات کو کمپیوٹر محفوظ کر لیتا اور ضرورت پڑنے پر لمحہ بھر میں سامنے لے آتا ہے۔ اس سلسلہ کو مزید سمجھنے کے لئے مارچ ۹۹ء کے محدث میں مطبوعہ مضمون (ص ۴۷) ملاحظہ فرمائیں۔

اس سارے انقلاب کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے، کون سا ایسا وہ عظیم کارنامہ رونما ہوا ہے جو گذشتہ سارے کام کو نئے روپ میں لانے کا متقاضی ہے۔ اس کے لئے ہمیں پیچھے جاکر موازنہ کرنا ہوگا کہ اس وقت بحث کا کام کس طرح کیا جاتا تھا اور آج اس میں کیا تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

اپنی ناقص معلومات کے مطابق کمپیوٹر کے متعارف ہونے سے قبل ہمارا کام کرنے کا انداز درج ذیل تھا۔ آج تو ہم کتب اور اس کے ہر صفحہ میں موجود مختلف اکائیوں (یونٹس) کی انڈیکسنگ کی بات کرتے ہیں، اس سے پہلے ہمیں مکمل کتاب تک رسائی کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ کتاب جو علم کا بنیادی وسیلہ ہے تک رسائی کے لئے ہر لائبریری میں بڑی دردسری سے کیٹلاگنگ کی جاتی۔ لائبریری میں کیٹلاگنگ کا عملہ روزانہ اوسطاً ۱۵ سے ۲۰ کتب کی تکمیل کرتا۔ اس طرح برسوں میں ایک لائبریری متعدد صاحبِ فن حضرات کی دن رات کی محنت سے اس قابل ہوتی تھی کہ صرف تین طریقوں (نام مصنف، نام کتاب اور موضوع کے ذریعے) سے کسی کتاب کو حاصل کرنا ممکن ہوتا تھا۔ اس کامیابی تک پہنچنے کے لئے لائبریرین حضرات کو جس قدر پاپڑ بیلنے پڑتے، وہ یہ کام کو کرنے والوں کو علم ہے یا جنہیں اس کام کی نگرانی رمشاہدے کا کبھی موقع ملا ہو۔ اس کے بعد تیار کردہ کیٹلاگ سے استفادہ کرنا بھی ایک مشکل کام ہوتا۔ بعض اوقات کسی کتاب کو ان کارڈز سے ہی حاصل کرنے میں گھنٹوں صرف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تمام اہم لائبریریوں میں ابھی تک یہی طریقہ زیر استعمال ہے اور اسی کو جدید سائنسی کلاسیفکیشن (ترتیب بندی) کہا جاتا ہے۔

ابجدی ترتیب کے مطابق تقسیم کرنے اور مطلوبہ لفظ تک پہنچنے کا یہ سلسلہ برسہا برس سے جاری ہے۔ رواں صدی میں جب قرآن کریم کے الفاظ اور پھر احادیثِ نبوی تک پہنچنے کے لئے المعجم المفهرس لألفاظ القرآن اور المعجم المفهرس لألفاظ الحديث کی جب ترتیب مکمل ہوئی تو واقعتاً علماء نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ تصور کیا۔ ایک جرمن مستشرق کے ذریعے حدیث کی ۹ کتب اور بعد ازاں متعدد کتب کے الفاظ تلاش کی سہولت مہیا کرنے والی کتابیں کثیر جلدوں میں سامنے آئیں تو ایک انقلاب کا آغاز ہوا۔ کئی صدیاں قبل ڈکشنریوں، مُعجَمات، اسماء الرجال اور اسی طرح کے موضوعات پر لکھی جانے والی کتب میں بھی ابجدی ترتیب والا طریقہ ہی رائج رہا۔ لیکن چونکہ یہ مطلوب و مراد تک پہنچنے کا بہت ہی محدود طریقہ تھا اور اس کی تیاری میں بھی جس قدر محنت صرف ہوتی تھی اس کا اندازہ بھی تھوڑے سے غور و فکر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ان سے فائدہ اٹھانے میں بھی معقول وقت صرف ہوتا لہٰذا اس میں آسانی کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

یہ تو وہ صورتِ حال ہے جس کی مثال اسلامی لٹریچر میں ہمیں صدیوں سے اور روزمرہ

معمولات میں بھی بکثرت ملتی ہے کہ ابجدی ترتیب کے ذریعے بڑے مواد کو ترتیب دیا جائے۔ اگر ہم گذشتہ چند دہائیوں میں کتابوں میں اسی حوالے سے جدید رجحان کا جائزہ لیں تو بالخصوص ترقی یافتہ قوموں میں شائع ہونے والی کتابوں کے آخر میں انڈیکسنگ اور مختلف الفاظ کے ذریعے مطلوب تک پہنچنے کا رجحان بکثرت دیکھنے میں آیا ہے۔ جو ابھی ہمارے ہاں زیادہ رواج تو نہیں پاسکا لیکن بعض باسلیقہ مصنفین نے اس کا اہتمام کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انہی برسوں میں منظر عام پر آنے والی تفاسیر مثلاً تفہیم القرآن، تیسیر القرآن اور تدبر قرآن وغیرہ کے آخر میں اشاریہ بندی کا اہتمام دیکھنے میں آتا ہے۔ جدید اسلوبِ تحریر کی بات چلی ہے تو یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ ہمارے لٹریچر میں موضوعات بندی، موضوع پر نکات وار اپنا نکتہ نظر پیش کرنے اور پیراجات کے ذریعے مختلف اُمور کو جدا کر کے دکھانے اور اس طرح قاری کے ذہن میں اپنے استدلال کا ایک واضح خاکہ از خود بنا دینے کا رجحان بھی رواں صدی میں ہی زیادہ متعارف ہوا ہے۔ اب جبکہ قاری کے پاس وقت کی قلت ہوتی ہے اور بے شمار مصروفیات میں ذہن اُلجھا ہونے کے باعث اسے یکسوئی سے مطالعے میں دقت کا سامنا ہوتا ہے، اس لئے اس کے ساتھ ساتھ اُسلوبِ تحریر و تحقیق میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے۔ ہمارے اہل علم طبقہ کو چاہئے کہ اپنے موقف واستدلال کو بیان کرتے ہوئے اس جدید اسلوب کو بھی پیش نظر رکھیں۔

کمپیوٹر کے آنے کے بعد بے شمار حوالوں سے پیش رفت ہوئی ہے۔ کمپیوٹر اپنے اندر تمام اندراجات کو از خود حروفِ تہجی کی ترتیب دے دیتا ہے۔ اس کے لئے صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ معلومات یا پوری کتاب کی عبارت اس میں داخل کر دی جائے۔ اب نہ تو حروف کی ترتیب میں طویل وقت لگانے اور محنت و مشقت کے صبر آزما مراحل سے گزرنے کی ضرورت ہے، نہ ہی اس مطلوب کو حاصل کرنے میں چند ساعتوں اور چند بٹنوں سے زیادہ دبانے کی کوئی ضرورت۔ صرف یہ نہیں کہ کمپیوٹر میں داخل شدہ تمام الفاظ کی از خود ترتیب بندی ہو جاتی ہے بلکہ کسی لفظ کے درمیانی حروف کی ترتیب بھی تیار ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر جہاد کا لفظ کمپیوٹر میں شامل ہو تو ھاد (کوئی درمیانی حرف) اور جھد (بنیادی مادہ Root) کی ترتیب بندی بھی ہو چکتی ہے اور اس طرح بھی الفاظ کو ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

ادارۂ محدث میں ایسے کمپیوٹر پروگرام بھی موجود ہیں جن کے ذریعے کسی کتاب کا مکمل انڈیکس بھی لمحوں میں تیار کیا جاسکتا ہے۔ مصر کی معروف کمپنی صَخر کے تیار کردہ الفهرسة الالية نامی پروگرام میں کسی کتاب کو لایا جائے تو چند منٹ میں وہ تیار شدہ انڈیکس آپ کے حوالے کر دے گا۔ صاحبانِ تصنیف بخوبی جانتے ہیں کہ انڈیکس تیار کرنے کا کام بھی کس قدر محنت طلب کام ہوتا تھا۔

کمپیوٹر کی دو اہم خصوصیات

ہمارے لئے کمپیوٹر کی دو خوبیاں بالخصوص قابل ذکر ہیں :

(i) کمپیوٹر بہت بڑے مواد کو مکمل اور محفوظ ترین صورت میں بآسانی بڑی مختصر جگہ پر محفوظ کر

لیتا ہے۔ اسی خاصیت کی وجہ سے عبارت (Text) آواز (Audio) اور تصویری حرکت (Video) کی پیشکش کے لئے اس کو ان دنوں بکثرت استعمال کیا جارہا ہے۔ محفوظ ہونے کی جگہ (ظرف) کے طور پر CD کو استعمال کیا جاتا ہے جس کی مالیت ان دنوں مزید کم ہو کر ۵۰/۶۰ روپے تک آ پہنچی ہے اور روزانہ لاکھوں صفحات (کتب) ہزاروں آوازیں (کیسٹیں) اور سینکڑوں فلمیں (ویڈیو کیسٹیں) CD کے ذریعے عام مارکیٹ میں پیش کی جارہی ہیں۔

(ii) دوسری اہم ترین خاصیت تمام جمع شدہ مواد کو طلب کرنے پر سیکنڈوں میں پیش کردیتا ہے یعنی Search (تلاش)..... کتابوں میں حروفِ ابجد کی بنیاد پر تلاش کی سہولت انقلاب خیز ہے۔ چند برسوں سے جس موضوع پر سائنس دان سرگرم عمل ہیں کہ کمپیوٹر مفہوم و مراد سمجھنے کے قابل ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل ترین امر ہے کہ اپنے اندر موجود تمام مواد کو کمپیوٹر از خود سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ کروڑوں صفحات کو سو فیصد یاد رکھنے والا کمپیوٹر جب اپنی سمجھ سے از خود اس سے متعلقہ مباحث پیش کردے گا تو یہ ایک تہلکہ مچادینے والی صلاحیت ہوگی۔ اس صلاحیت کے حاصل ہونے کے بعد کتب کی تجزی و تحلیل کی ضرورت اور مختلف موضوعات کی لمبی چوڑی فہرست تیار کرنے کی ضرورت بھی ختم ہوجائے گی۔ جس طرح کسی کتاب کو صرف کمپیوٹر میں داخل کردینے پر اس کے تمام الفاظ اور ان کے درمیانی حروف کی ترتیب بندی از خود ہوجاتی ہے، اسی طرح اگر کمپیوٹر عبارت کو بھی سمجھنا شروع ہوجائے تو اس کے ذریعے صرف موضوع دے دینے پر تمام کتب سے اس کے حوالے از خود نکلنا شروع ہوجائیں۔

بنیادی طور پر موضوعات کے مطابق تلاش کا کام بھی دراصل پہلی سہولت کا ہی اعجاز ہے۔ میں اپنے پہلے مضمون مطبوعہ محدث، مارچ ۹۹ء (صفحہ ۴۴) میں تلاش کے دو طریقے لکھ چکا ہوں کہ لفظ وار یا موضوع وار سرچ (بحث)۔ موضوع وار سرچ میں دراصل مختلف موضوعات قائم کرکے اہل علم کتب کی مختلف اکائیوں کو ان موضوعات سے مربوط کردیتے ہیں۔ بعد ازاں ان موضوعات کو بھی لفظ وار بحث کی مدد سے ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کمپیوٹر موضوع کو نہیں سمجھتا بلکہ صرف لفظ کی بنا پر امتیاز کرتا ہے تو صرف وہی موضوعات اور ان کی عبارتیں تلاش کرپائے گا جو موضوعات اور ان کی فہرستیں کمپیوٹر میں داخل کی گئی جبکہ اگر کمپیوٹر خود سمجھنا شروع کردیتا ہے تو محدود موضوعات کا بھی مسئلہ باقی نہیں رہتا اور اہل علم کی کتب کی تحلیل و تجزی کا معاملہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ دو برس قبل سائنس دانوں نے اس بارے میں ابتدائی کامیابی حاصل کرلی ہے کہ کمپیوٹر عبارت کا مفہوم از خود سمجھنا شروع کردے۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس میں مکمل کامیابی حاصل ہوجائے تو عبارت کو سمجھنے میں کمپیوٹر کی صلاحیت کم و بیش ہوگی۔ جس طرح ایک عبارت سے دو انسان اپنے اپنے ذوق، میلان اور علمی صلاحیت کے مطابق مفہوم

اَخذ کرتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں مشینی انداز میں مفہوم سمجھنے کی اس کوشش میں غلطی کے بہت زیادہ امکانات کے ساتھ ساتھ عبارت کو سمجھنے کی صلاحیت بھی جزوی حد تک ہوگی، اسکے باوجود کسی بھی درجے کی یہ صلاحیت علم کی راہ میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔

سب سے پہلے تو اس کے لئے یہ سادہ ترین طریقہ استعمال کیا گیا کہ صرف ایک لفظ کو ڈھونڈنے کی بجائے مخصوص دائرہ کار میں متعدد الفاظ کو تلاش کیا جائے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو لندن کے اخبارات میں کارگل کے مسئلہ پر مختلف دنوں میں چھپنے والا امریکی ردّعمل جمع کرنا ہے تو اس کے لئے وہ کمپیوٹر کو London+Newspapers+America+Kargel کے امتیازی الفاظ کے ساتھ مطلوبہ تاریخوں سے علیحدہ مقام پر محدود کر کے خبریں تلاش کرے گا۔ اس طرح اکثر اوقات مطلوبہ چیز تک رسائی نہیں ہوپاتی۔ کیونکہ ممکن ہے مطلوبہ مقام میں بعینہٖ یہ الفاظ استعمال نہ ہوئے ہوں بلکہ ان کا کوئی مترادف لفظ ہو۔ چنانچہ مترادف الفاظ کی ایک مکمل لائبریری بھی کمپیوٹر کے پاس موجود ہوتی ہے جن کے ذریعے وہ اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن بعض پروگراموں میں ایسی ابتدائی کوششوں کے آثار ملتے ہیں کہ وہاں کمپیوٹر مختلف طریقوں سے مشینی انداز میں مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس دان عنقریب کسی بھی درجہ میں اس کوشش میں بھی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

بہرحال یہ ساری کوششیں فی الوقت بحث (Search) تک محدود ہیں۔ جمع شدہ معلومات کو جس طرح بھی جمع کرلیا جائے: لفظ وار بحث کے ذریعے یا مفہوم کا امتیاز کر کے، ان پر تبصرہ و تجزیہ کا کام تو انسان کو ہی کرنا ہے۔ ہمیں اس مقام پر اپنی محنت کو کام میں لانا چاہئے جب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔ جہاں یہ کام مشینیں کرسکتی ہوں تو وہاں مشینوں کی کارکردگی سے فائدہ اٹھا کر اپنا وقت اور محنت بچائی جاسکتی ہے اور اسے زیادہ اہم تر مقام پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ یہ بالکل نئے موضوعات ہیں جن پر سرے سے کوئی لٹریچر موجود نہیں چنانچہ اکثر اوقات بات کی وضاحت اور استدلالی خاکہ کی بناوٹ میں وہ ترتیب باقی نہیں رہتی کہ تمام مباحث منطقی ترتیب کے ساتھ یکجا ہوجائیں۔ میری طرف سے ان موضوعات میں زیادہ کوشش اس امر پر مرکوز ہوتی ہے کہ بات کسی طرح قاری کو کچھ نہ کچھ مفہوم دے جائے۔ اور وہ ان پیچیدہ چیزوں کو کسی درجے میں سمجھ کر ذہن میں بٹھالے، اسی کوشش میں اکثر اوقات بات سے بات نکلتی جاتی ہے کیونکہ ایک بات کو سمجھانے کے لئے دوسری کئی باتوں کا سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ باذوق حضرات اس مشقت کو خوشدلی سے قبول کریں گے۔ مجھے یقین ہے ان موضوعات پر ان کے مضامین کے مطالعے کے بعد کوئی اور لکھنا چاہے تو زیادہ واضح طور پر اپنا مدعا قارئین کو پیش کرسکے گا۔ ذیل میں ہم علم و تحقیق کے حوالے سے دیگر بدلتے رجحانات کی طرف لوٹتے ہیں ..... (جاری ہے)

ماشاء اللہ خوب مضمون ہے اللھم زد فزد ۶۱

یادِ رفتگاں — ادارہ 'محدث'

شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد عبدہٗ الفلاح کا سانحۂ اِرتحال

افسوس ہے کہ ۳۰؍جون ۱۹۹۹ء کو تقریباً صبح ۶ بجے صبح معروف عالم، بلند پایہ مدرّس، شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد عبدہ الفلاح رحلت فرماگئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون!

جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں، جس کے محلہ حاجی آباد میں مرحوم کی رہائش تھی، نمازِ ظہر کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، پہلی نماز ان کے فاضل تلمیذ حافظ عبدالعزیز علوی صاحب شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ نے پڑھائی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مرحوم کے ایک اور فاضل شاگرد مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ) نے دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی، جو لاہور سے قدرے تاخیر سے پہنچے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد مرحوم کا جنازہ ان کے گاؤں سرواں چک ۵۴۰ گ ب تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد لے جایا گیا جہاں ۶ بجے شام ان کی تدفین عمل میں آئی۔

نمازِ جنازہ میں جامعہ کے طلباء واساتذہ کے علاوہ گوجرانوالہ، لاہور، فیصل آباد اور دیگر شہروں سے بکثرت علماء اور احبابِ جماعت شریک ہوئے۔

مرحوم اپنی عمر طبعی گزار کر ہی دنیائے فانی سے دارالبقا کو روانہ ہوئے ہیں۔ وفات کے وقت تقریباً ۸۲ سال ان کی عمر تھی، چند سالوں سے ضعف ونقاہت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے خواہش کے باوجود وہ علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کا کوئی خاص کام نہیں کرسکے۔ چند سال قبل کچھ عرصہ وہ مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور میں بھی رہے اور یہاں صحیح بخاری کے عربی حواشی پر نظر ثانی کے علاوہ انہوں نے صحیح مسلم کے عربی حواشی تحریر کرنے شروع کئے تھے، لیکن وہ کام بھی ضعف وکبر سنی کی وجہ سے زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ بالآخر ۳۰؍جون کو ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا غفر اللہ لہٗ ورحمہٗ۔ ذیل میں ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی بعض خود نوشت یادداشتیں پیش کی جارہی ہیں۔ ادارہ

مختصر حالاتِ زندگی اور تدریسی وتصنیفی خدمات

آپ کی وِلادت قریہ وٹو مراڑ تحصیل مکسر ضلع فیروزپور میں ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔ قمری مہینوں کے مطابق یہ تاریخ ۱۷؍رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ تھی۔ آپ کے والدِ محترم کا نام نظام الدین واصل خان تھا۔

حصولِ تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں حاصل کی اور مڈل کی تعلیم کے دوران سکول کو خیرباد کہہ دیا اور دینی تعلیم کے حصول میں مشغول ہوگئے۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے گاؤں اور اس کے قریب ایک قریہ بودیمال (بڈھیمال) میں حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد، حافظ محمد عبداللہ کھپیانوالی کی درس گاہ میں استفادہ کرتے رہے۔ آپ

نے اعلیٰ تعلیم مدرسہ عالیہ دہلی سے حاصل کی۔ اور علم حدیث حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی کے حلقات میں شرکت کر کے حاصل کیا۔

تدریس

ابتدائی طور پر تدریس کا آغاز اپنے گاؤں وٹو مراڑ کے ایک مدرسہ سے کیا۔ پھر اس کے بعد آپ نے جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ، مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈانوالہ، دارالحدیث رحمانیہ دہلی، تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور، دارالحدیث، عام خاص باغ ملتان، جامعہ محمدیہ اوکاڑہ، جامعہ اہلحدیث لاہور اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔

تخصص: آپ ابتدا میں علوم آلیہ: عربی ادب و قواعد، عقائد و کلام اور منطق و فلسفہ کا زیادہ ذوق رکھتے تھے اور درسِ نظامی میں شامل ایسی کتابوں کی تدریس میں خصوصی مہارت کے حامل رہے لیکن بعد ازاں انہی علوم نے انہیں قرآنِ کریم سے خاص شغف مہیا کر دیا تو قرآنِ کریم کے تفسیری کام سے گزرتے ہوئے علومِ حدیث کی طرف مائل ہوئے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ حدیث اور محدثین کے بارے میں تدریس و تصنیف کرتے ہوئے گزرا۔ آپ ہمارے مشہور دینی مدارس میں 'شیخ الحدیث' کے منصب پر فائز رہے اور اسی مناسبت سے اِفتاء کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔

مربی اساتذہ کرام

آپ کے اساتذہ کرام میں سے چند مشہور نام مندرجہ ذیل ہیں:

استاذ الاساتذہ حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل سلفی، مولانا عبدالغنی، مولانا محمد رمضان، مولانا محمد عبداللہ کھپیانوالی، مولانا سلطان محمود گجراتی، مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، مولانا عبدالرحمٰن کابلی مجذوب اور مولانا فخر الحسن وغیرہم

تلامذہ

آپ کے شاگردوں میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں: مولانا ہدایت اللہ ندوی، مولانا صوفی محمد، مولانا محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب جہلمی، مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا عبدالسلام کیلانی، حافظ عبداللہ امجد چھتوی، مولانا عبدالقادر ندوی، مولانا حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی، قاضی محمد اسلم سیفؒ، مولانا عبدالرشید نو مسلم، حافظ عبدالرشید گوھڑوی، مولانا ولی محمد، مولانا محمد یوسف وغیرہ

اہم تالیفات

(۱) حاشیہ قرآنِ کریم بنام اشرف الحواشی

(۲) اردو ترجمہ مفردات القرآن از امام راغب اصفہانی

(۳) مآثر الکرام حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی ۱۲۰۰ھ تصحیح و حواشی فارسی مع تکمیل مؤلفات و فہارس رجال مع مراجع شائع کردہ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ

(۴) جلد ثالث ترجمان القرآن، مولانا آزاد کی تکمیل اور جمع و ترتیب

(۵) سیرتِ ابن حجر و تراجم رجالِ اسانید ابن حجر جو انہوں نے مقدمہ فتح الباری میں ذکر کی ہیں۔
(۶) الارشاد الی مہمات الاسناد از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحقیق و حواشی (زیر طبع)

نوٹ: مرحوم نے ایک مناسبت سے اپنی علمی زندگی کے بارے میں مختصراً ایک تحریر بھی فرمائی تھی۔ جو سیرتِ حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں آپ کے تیار کردہ کتابچہ کے شروع میں طبع بھی ہوئی۔ ثقاہت کے اعتبار سے خود نوشت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے، اسی لئے ہم اسی کو شائع کرتے ہیں..... ادارہ

[redacted]

پس منظر: راقم الحروف نے الصحیحین اور السنن الأربعة پر تفصیلی مقالے تحریر کئے جو بالاقساط ماہنامہ محدث لاہور[1] میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد یوسف آف راجووال شیخ الحدیث و بانی جامعہ کمالیہ راجووال مقالہ صحیح بخاری سے متاثر ہوئے اور موصوف نے اس کی طباعت و نشر کے سلسلہ میں راقم کو خط لکھا۔ راقم نے ان کے مکتوب سے متاثر ہو کر فرحتِ قلب کے ساتھ ان کو اجازۂ ملک دیا جواباً مولانا نے تحریر فرمایا کہ الصحیحین کے دیباچہ میں مؤلف کے ترجمہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے آپ خود ہی اپنا مختصر تعارف لکھ دیں تاکہ اس کے دیباچہ میں شامل کر دیا جائے۔ راقم کچھ عرصہ تو متامل رہا پھر بالآخر مولانا موصوف کی حوصلہ افزائی کے پیش نظر اس کی ابتدا کر ہی دی۔

آبائی گاؤں

میرا مولد قریہ وٹو مراڑ تحصیل مکسر ضلع فیروزپور ہے اور ہمارے گاؤں کے پڑوس میں ایک قریہ صغیرہ تھا جو اہل علم کا گاؤں تھا اور بودیمال (بڈھیمال) کے نام سے معروف تھا۔ موجودہ چک ۳۶ ستیانہ روڈ، فیصل آباد اسی قریہ صغیرہ کا دوسرا عنوان ہے۔ میرے والد محترمؒ کا نام نظام الدین واصل خان تھا۔ میری اصل برادری تحصیل فاضلکا (فیروزپور مشرقی پنجاب) ہیڈ سلیمان کی باسی تھی جو منتقل ہو کر گاؤں وٹو مراڑ میں رہائش پذیر ہو گئی یہاں گزران کے لئے کچھ زراعتی زمین مل گئی۔

والدہ کی روایت کے مطابق میری ولادت ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۷ء) ہے۔ والد مرحوم صرف ناظرہ قرآن پڑھے ہوئے تھے تاہم پنج وقتہ مسجد کے نمازی تھے۔ میرے ننھیال ضلع حصار سوتر کے علاقہ میں 'ناگوکی' کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق چوہان برادری سے تھا، بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے اور اچھے خاصے زمیندار تھے۔ قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھتے جس کے حاشیہ پر کامل تفسیر حسینی تھی، وہ قرآن مجھے ورثہ میں ملا تھا..... سوتر کا علاقہ مولوی نور محمد سوتروی مؤلف 'شہباز' کا وطن تھا اور 'ناگوکی' کے قریب سے دریا گھاگھرا بہہ رہا تھا۔ مولوی نور محمد نے شہباز میں اس علاقہ کی جہالت اور گمراہیوں کا ذکر کیا ہے اور مراجع دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

؎ سوتر دیوچہ قسمت ساڈی جتھے کال کتاباں

اور ایک مقام پر شہباز کی مدح و ثناء میں لکھتے ہیں:

سوتر والی نالی دے وِچ نور ترائے بیڑے
نور دے وِچ قصور نہیں کوئی پر منظور نہیں کردے بھیڑے

یہ علاقہ جہالت اور رسومِ شرکیہ کا گڑھ تھا اور وجودیہ، اتحادیہ اور حلولیہ وغیرہ گمراہ فرقے پائے جاتے تھے۔ مولانا عبداللہ حکیم آف منڈی جہانیاں کا گاؤں بھی روڑی تحصیل سرسہ تھا اور ان کے والد محترم صوفی سلیمان روڑی کے رہنے والے تھے۔ حکیم عبداللہ صاحب تحریکِ اہل حدیث کے سلسلہ میں لکھتے رہتے تھے۔ تحصیل سرسہ میں دو عالم تھے: ایک مولانا نور محمد مؤلف شہباز اور دوسرے میرے دادا جی جمال الدین اور یہ دونوں پکے حنفی مقلد تھے، باقی سب اہل بدعت تھے۔ تحصیل سرسہ میں سب سے پہلے میرے والد مولوی محمد سلیمان اہلحدیث ہوئے جنہوں نے امام عبدالجبار غزنوی کی بیعت کی اور حافظ محمد لکھوی سے مستفیض ہوئے۔

ننھیال کے پڑوس، روڑی میں مولوی سلیمان کی ملاقات کے لئے جاتا رہا ہوں اور مرحوم مجھے وظائف و اوراد کی بھی تلقین کیا کرتے، مولوی نور محمد سوتروی سید کمال الدین دہلوی کے مرید تھے جو وحدۃ الوجود کے قائل تھے اور یہی چیز تھی جس کی شناعت (برائی) مولوی نور محمد کے دل میں کھٹکتی رہی اور انہوں نے اپنے پیر کے ساتھ مناظرہ کیا اور یہ فیصلہ شاہ عبدالعزیز کے پاس پہنچا تو انہوں نے سید کمال کے حق میں فیصلہ دیا اور وہ فیصلہ جو شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ کا ہے، سید کمال الدین کے پوتے کے پاس محفوظ ہے۔

حصولِ تعلیم

میری تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں ہوئی۔ مڈل کے اثنا میں سکول کو خیرباد کہہ دیا اور دینی تعلیم کے حصول میں مشغول ہو گیا۔ گاؤں میں مولوی محمد رمضان سے ترجمہ قرآن شروع کر لیا۔ مولوی صاحب تفسیر محمدی پر دیکھ کر ترجمہ پڑھاتے اور پنجابی نظم میں تفسیر بھی پڑھتے اور اس کے بعد قاضی محمد حسین مجھے بودیمال مولوی عبدالغنی صاحب کے پاس چھوڑ آئے۔ پرائمری سکول میں مولوی عبدالرحمٰن مدرّس آف امین والا تحصیل زیرہ ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) تھے جن کے صاحبزادے چودھری خلیل الرحمٰن ایڈووکیٹ ہیں جو لاہور ہائیکورٹ کے جج بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد چوہدری صاحب کی رہائش گاہ (ماڈل ٹاؤن، لاہور) میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی اور راقم الحروف نے ان کو اشرف الحواشی بطور ہدیہ پیش کیا جس پر وہ خوش ہوئے اور خوشی کے آنسو رونے لگے اور مجھے بطورِ یادگار حمائل غزنوی امرتسر عطا کی۔

بودیمال مختصر سا قریہ تھا وہاں پر کچھ مولوی صاحبان تھے جو دینی تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے اور تقریباً سب ہی مولانا عطاء اللہ لکھوی کے تلمیذ تھے۔ بعض نے دوسرے مدارس میں تعلیم بھی حاصل کی تھی اولاً مشہور تر عالم مولانا عبدالرحمٰن نظام الدین تھے جو مولانا عبدالوہاب صدری دہلوی سے حدیث پڑھتے تھے اور عبدالوہاب صدری حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے پس مولوی عبدالرحمٰن بیک واسطہ میاں صاحب کے تلامذہ سے شمار ہوئے اور غالباً مدرسہ رحمانیہ کی وجہ تسمیہ بھی مولانا ہی کی ذات تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد راقم الحروف مولانا محمد عبداللہ صاحب کھیانوالی کے درس میں چلا گیا۔ مولانا خدا رسیدہ بزرگ اور حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے تلمیذ تھے۔

اس کے بعد گردشِ ایام نے دہلی پہنچادیا اور مدرسہ عالیہ دہلی میں داخلہ مل گیا۔ مدرسہ عالیہ فتح پوری دیوبندی ہے۔ اس میں عربی فاضل، منشی فاضل اور پینل امتحانات وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ اس مدرسہ میں میرے اہلحدیث رفیق مفتی عبدالقادر بلتستانی بھی پڑھتے تھے اور میرے اساتذہ میں مولانا سلطان محمود گجراتی صدر مدرّس مدرسہ عالیہ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، مولانا عبدالرحمٰن کابلی مجذوب اور مولانا فخرالحسن دیوبندی تھے۔ تین سال کے بعد وہاں سے فراغت کے بعد واپس وطن چلا آیا آئندہ سال کے لئے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ کسی اہل حدیث محدث کے پاس رہ کر حدیث پڑھنا ضروری ہے چنانچہ بندہ حسبِ مشورہ مولانا محمد گوندلویؒ کے پاس چلا گیا اور ان پر رفقاء کے ساتھ بخاری شریف کی قراءۃ کی اور دیگر کتب بھی پڑھیں اور سال کے خاتمہ پر سنوی امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ناظم مدرسہ استاذِ محترم ابوالخیر محمد اسمٰعیل سلفی نے میری سند کی پشت پر خاص طور پر اپنے دستخطوں کے یہ جملہ رقم فرمایا: "قد فاز الأقران" (اپنے ساتھیوں پر فوقیت حاصل کی) جو میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔

تدریس

فراغت کے بعد اپنے گاؤں وٹو مراڑ چلا آیا اور مدرسہ کا افتتاح کردیا۔ حسن اتفاق سے چند ممتاز طلبہ جمع ہوگئے جن میں مولانا ہدایت اللہ ندوی، مولانا صوفی محمد آف آرائیانوالہ اور مولانا محمد اسحٰق آرائیانوالہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پھر جب استاذِ محترم حافظ محمد گوندلویؒ قتل کے ایک جھوٹے کیس میں گرفتار ہوئے تو بندہ کو استاذِ محترم سلفی صاحب نے گوجرانوالہ تدریس کے لئے بلالیا، وہاں پر اُن کی ضمانت اور رہائی تک درس دیتا رہا۔ میرے درس میں اس وقت پیر محمد یعقوب جہلمی بھی شامل تھے جو ترمذی اور حماسہ پڑھتے تھے آئندہ سال کے لئے اوڈانوالہ چلا گیا۔ مدرسہ تعلیم الاسلام میں جلالین، نورالانوار، قطبی وغیرہ کتابیں میرے سپرد ہوئیں۔ جلالین، نورالانوار اور قطبی میں مولانا محمد یعقوب، مولوی محمد یوسف سفیر مدرسہ، مولانا خدا بخش وغیرہ شریک رہے اور کافیہ ابن حاجب میں مولوی عبدالقادر ندوی اور ان کے رفقاء شریک تھے۔ آئندہ سال کے لئے واپس اپنے گاؤں چلا آیا اور عزم کرلیا کہ اپنے گاؤں میں ہی رہوں گا تاہم گوجرانوالہ سے استاذِ محترم مولانا محمد اسمٰعیل سلفی کا مکتوبِ گرامی پہنچا کہ آئندہ سال دارالحدیث رحمانیہ دہلی چلے جائیں کیونکہ میں ان سے طے کر آیا ہوں چنانچہ ہفتہ عشرہ میں دارالحدیث سے خط بھی پہنچ گیا جس کے جواب میں رضامندی کا خط لکھ دیا گیا اور رمضان المبارک کے بعد میں دہلی دارالحدیث میں چلا گیا۔

دہلی سے تو بندہ مانوس تھا کیونکہ عرصہ تین سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا مگر رحمانیہ کا ماحول میرے لئے اجنبی تھا تاہم رحمانیہ میں کچھ پنجابی طلبہ کی وجہ سے وحشت جاتی رہی اور جمعہ کی شام کو کھانے پر جمع ہوئے تو اساتذہ سے بھی متعارف ہوگیا۔

مولانا عبید اللہ رحمانی سے بالمشافہ یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ رحمانی صاحب اس سال 'سیرت بخاریؒ' کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف تھے۔ بندہ بھی اس کام میں شریک ہو گیا اور شارحین بخاری کے وفیات بقیدِ سنین جمع کرنے لگ گیا۔ عجلت کی وجہ سے یہ کام گو مکمل نہ ہو سکا تاہم آئندہ ایڈیشن میں بعض وفیات کا اضافہ ہو گیا، مزید پھر نہیں ہو سکا۔ مجلّہ محدث میں اس حوالے کچھ مقالات[۲] بھی شائع ہوئے۔ اس طرح علمی ماحول میں وقت گزرتا رہا۔ دارالحدیث رحمانیہ میں پنجابی علماء آتے تو بعض کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہو جاتا۔ چنانچہ بھوجیاں سے مولوی عبدالرحمٰن خان ارخ کبیر مولانا عبداللہ بھوجیانی حج کے فارموں کے سلسلہ میں اپنے دو تین رفقاء کے ساتھ آئے تو مجھے میزبانی کا شرف ملا۔ اسی طرح ایک مرتبہ مولانا عطاء اللہ صاحب بھوجیانی اور مولانا محمد اسحٰق بھٹی تشریف لائے پھر قاضی عبید اللہ آف کوٹ کپور بمع رفقاء تشریف لائے اور انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی تو بندہ بھی ان کے ساتھ تھا، اسی کو غالباً بھٹی صاحب نے ریاستی وفد کہا ہے۔ رحمانیہ میں ہی مجاہد کبیر مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر ایک مکتوب میں کر چکا ہوں۔

بہر حال دارالحدیث رحمانیہ کے وہ ایام باغ و بہار لد گئے اور اس کی رونقیں خزاں ہو گئیں۔ جمعیت اہلحدیث کی تاریخ میں واقعی ایک شاندار مؤسسہ (ادارہ) تھا جس نے علمی رونق کو قائم رکھا۔ ۱۹۳۸ء میں شیخ عطاء الرحمٰن دہلوی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے پھر ان کے منجھلے صاحبزادے شیخ عبدالوہاب نے اس کا اہتمام سنبھالا اور دارالحدیث اپنی سابقہ شون و شوکت کے ساتھ تعلیمی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ شیخ عبدالوہاب وضع دار شخصیت کے مالک تھے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ساتھ برخوردارانہ تعلقات تھے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم، شیش محل روڈ، لاہور تشریف لائے تھے اور اساتذہ کے تعارف کے سلسلہ میں انہوں نے غزنویؒ صاحب سے فرمایا: ہاں میں ان (محمد عبدہ الفلاح) کو پہچانتا ہوں یہ ہمارے دارالحدیث دہلی میں مدرّس رہ چکے تھے۔

الغرض راقم الحروف نے سید غزنوی کی طلب پر تقویۃ الاسلام لاہور میں تدریس شروع کر دی۔ مدرسہ کے ہال میں ہم پر پہلا حملہ مچھر اور کھٹمل نے کیا جس سے سوائے پنکھے کے بچاؤ کی صورت نہ تھی۔ بالآخر مولانا غزنوی نے رات کو ہال کے اندر فرش پر اجتماعی نیند کی اجازت دے دی۔

حدیث کے اسباق مولانا محمد عطاء اللہ بھوجیانی صاحب کے پاس تھے جو کہ شیخ الحدیث تھے اور معقولات کی کتابیں مولانا شریف اللہ سواتی کے سپرد تھیں، باقی آداب عربیہ (نظم و نثر) راقم الحروف کے ذمہ تھیں اور درسِ نظامی کا یہ سلسلہ اچھے طریق سے چلتا رہا۔ بالآخر تقریباً ۱۹۵۳ء میں راقم الحروف ٹائیفائڈ سے بیمار ہو گیا اس کے بعد تدریس کے قابل نہ رہا اور مولانا غزنوی سے فراغت کے لئے طالب اجازت ہوا۔

مولانا سید غزنویؒ باُصول شخص تھے، انہوں نے فرمایا: "دیکھئے مولانا صاحب! آپ نے مدرسہ سے سبکدوش ہونا ہے تو استعفیٰ لکھ دیجئے تاکہ مدرسہ میں ریکارڈ رہے۔ چنانچہ بندہ نے اس بیماری کی حالت میں دو چار سطروں میں درخواست لکھ دی کہ مجھے مدرسہ سے فارغ کر دیا جائے۔ مولانا غزنوی

"صاحب نے باقاعدہ تحریری طور پر میرا استعفیٰ منظور فرمالیا اور مجھے ایک ملفوف دے دیا جس میں لکھا تھا کہ "میں آپ کا استعفیٰ منظور کرتا ہوں اور آپ کی پانچ سالہ خدمات کا اعتراف کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب کو صحت عطا فرمائے اور آپ دوبارہ تدریس کے لائق ہو جائیں۔" چنانچہ مولانا کی وہ تحریر تبرکاً میرے پاس محفوظ ہے یہاں پر اس کا عکس دے دیا ہے تاکہ تحریر محفوظ ہو جائے۔

عکس تحریر مولانا سید داود غزنویؒ

اس طرح راقم الحروف نے پانچ چھ ماہ کا عرصہ اپنے چک ۳۴، اوکاڑہ میں گزارا۔ اس رمضان المبارک سے قبل آئندہ سال کے لئے ملک عبدالعزیز ملتانی میرے چک میں آئے اور دارالحدیث ملتان کے لئے وعدہ لے گئے۔ چنانچہ آئندہ سال دارالحدیث ملتان عام خاص باغ میں صدرُ المدرّسین اور شیخ الحدیث کی سند حاصل ہو گئی اور یہی وہ سال تھا کہ حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی اور قاضی محمد اسلم صاحب میرے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور انہوں نے صحیح بخاری کے ساتھ کچھ اسباق بھی شروع کر لئے۔

رفیقین جمعیت طلبہ اہلحدیث کے بالترتیب صدر اور ناظم اعلیٰ تھے چنانچہ سال کے خاتمہ پر انہوں نے جمعیت طلبہ کی سالانہ کانفرنس کا پروگرام میاں چنوں میں بنادیا اور مجھے صدارت کے لئے پیشکش کی۔ بندہ نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور خطبۂ صدارت کی تیاری شروع کر دی جو کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا اور مطبوعہ صورت میں تقسیم بھی ہوا۔ آئندہ سال کے لئے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے ناظم نے روک لیا اور میں نے بھی چک کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کو سہولت خیال کر کے منظور کر لیا۔

مگر ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہو، انہی دنوں مرکزی جمعیت اہلحدیث نے جامعہ سلفیہ کے افتتاح کا پروگرام بنالیا اور مجھے اساتذہ میں شامل کرنے کی تجویز بھی زیر غور آئی۔ پہلے سال تو جامعہ کا درجہ تکمیل اس وقت کے تدریسی پروگرام کے مطابق لاہور ہی میں شروع کر دیا گیا اور لاہور میں جماعت کے لائق ترین اساتذہ کی موجودگی میں بیرونِ لاہور سے کسی مدرّس کی ضرورت نہ تھی۔ استاذِ محترم علامہ محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور سید داؤد غزنوی ایسے لائق اور اصحابِ مسانید کی موجودگی میں کسی دوسرے کو دعوت دینا بھی گستاخی ہی تھی اور پھر مذکورہ اصحاب کا معاملہ پیشہ ور مدرّسین کی طرح نہ تھا بلکہ ان سب حضرات نے جماعتی خدمت سمجھ کر رضاکارانہ طور پر وقت دینا قبول کیا تھا، ورنہ ان کی اس خدمت کا نہ تو کچھ معاوضہ دیا جا سکتا تھا اور نہ ہی یہ اصحابِ عزت واحترام معاوضہ کے متعلق کچھ سوچ ہی سکتے تھے۔ اسباق کی تقسیم کے مطابق سال بھر لیکچرز کا یہ سلسلہ

چلتا رہا اور آئندہ سال کے لئے نئے پروگرام بھی بنتے رہے اور راقم الحروف سے بھی اوکاڑہ مراسلت ہوتی رہی۔ یہ بعض مکتوبات لاہور سے اوکاڑہ پہنچانے میں مولانا عبدالعظیم انصاری نے سعادت کے فرائض سرانجام دیئے۔ مرکزی حضرات کے یہ مکاتیبِ گرامی میری خاص فائل میں محفوظ ہیں۔ یہ مراسلات کافی تعداد میں ہیں جن میں سید محمد داؤد غزنوی مرحوم، استاذِ محترم شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی مرحوم اور مولانا محی الدین صاحب قصوری ناظم تعلیماتِ مرکزیہ کے خطوط خصوصی اہمیت رکھتے ہیں اور جماعتی پالیسی کے وضع کرنے اور جامعہ سلفیہ کے تدریسی منہج کو درست رکھنے میں معاون ہو سکتے ہیں...... ۱۰ر مئی ۱۹۵۷ء کے "الاعتصام" میں اعلان ہوا :

"جامعہ سلفیہ میں ممتاز علماء کی شرکت فرمائی" شیخ الجامعہ مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی، مولانا شریف اللہ صاحب اور مولانا محمد عبدہ الفلاح صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔

یہ اعلان مولانا محی الدین احمد قصوری ناظم تعلیماتِ مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کی طرف سے تھا جس میں اساتذہ کا تعارف بھی تھا۔ اس سال درجہ اعلیٰ کے ساتھ درجہ ثانویہ بھی رواں دواں تھا۔ طلبہ کے تاثرات نہایت سنجیدہ اور عمدہ تھے۔ راقم الحروف کے متعلق پروفیسر غلام نبی صاحب وہ مکتوب دیکھ سکتے ہیں جو موصوف نے یٰسین چودھری صاحب مدیر جامعہ کے نام لکھا اور انہوں نے متعلقہ حصہ مجلہ اہلحدیث میں اشاعت کے لئے بھیج دیا (تاریخ محریہ یاد نہیں) جامعہ کے متعلق پورا ریکارڈ عاجز کے پاس موجود ہے جو الاعتصام میں شائع ہوا۔ راقم الحروف عرض گزار ہے کہ جامعہ سلفیہ ایک تحریک ہے جس کے ذمے جماعتی تنظیم کو مضبوط کرنا اور رِجالِ کار مہیا کرنا ہے جو ہر خلا کو پر کر سکیں۔ اس کے بعد میں قاضی محمد اسلم سیف☆ اور پروفیسر غلام نبی سے گزارش کروں گا کہ وہ ان اوراق کو مکمل کر دیں جو میں نے ان کے سپرد کئے ہیں۔ والسلام محمد عبدہ الفلاح (فروری ۱۹۹۵ء)

☆ عجب اتفاق ہے کہ قاضی اسلم سیفؒ دو برس قبل مولانا کی زندگی میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اب مولانا کے حسب ارشاد یہ ذمہ داری آپ کے شاگردِ رشید پروفیسر غلام نبی صاحب کو ہی بجالانی ہے جو ان کے استاذِ مکرم کی سوانح ہونے کے ساتھ جماعت کی علمی تاریخ بھی ہے۔ ہم پروفیسر صاحب سے اس مبارک کام کی جلد تکمیل کی توقع کرتے ہیں۔ ادارہ

[illegible]

(۱) مقالات برموضوع صحیح بخاری و سنن اربعہ

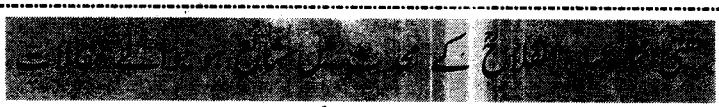

☆ امام بخاریؒ اور الجامع الصحیح (جنوری ۹۳ء) ☆ صحیح بخاری، روایات اور شروح (اپریل ۹۳ء)

☆ حدیث معلق اور صحیح بخاری (اگست ۹۳ء) ☆ امام ابوداودؒ اور سنن ابوداود (جون ۹۴ء)

☆ امام نسائیؒ اور سنن نسائی (جنوری ۹۴ء) ☆ امام ترمذیؒ اور جامع ترمذی (اکتوبر ۹۴ء)

☆ امام مالک اور موطا کا تعارف، موطا امام محمدؒ سے تقابل (دسمبر ۹۴ء)

(۲) تذکرہ علماءِ کرام

☆ حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ (اگست ۹۳ء) ☆ مولانا محمد ابراہیم آرویؒ (نومبر ۹۴ء)

اسی شمارہ میں آپکا ایک وقیع مضمون "قرآن فہمی کے بنیادی اُصول" بھی شاملِ اشاعت ہے

عہد ساز شخصیتیں

مولانا وصی اللہ مدنی، نیپال

محدثُ العصر علامہ البانی اور 'شاہ فیصل ایوارڈ'

"مؤسسة الملك فيصل الخيرية" مملکتِ سعودی عرب کی مؤقر تنظیم ہے جس کے زیر اہتمام ہر سال عالم اسلام اور بیرونی دنیا کے مفکرین اُدباء، اُطباء اور علماءِ دین کو ان کی دعوتی، تبلیغی، تصنیفی، سماجی اور رفاہی خدمات پر 'شاہ فیصل ایوارڈ' دیا جاتا ہے۔

سعودی عرب منطقہ عَسِیر کے امیر شاہ خالد فیصل کے حسبِ ارشاد شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ میں اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں اس تنظیم کے ذمہ داروں نے 'شاہ فیصل ایوارڈ' عالم اسلام کے نمایاں خدمات والے حضرات کو دیئے جانے کی قرارداد منظور کی اور "جائزة الملك فيصل العالمية" کا رئیس شاہ خالد فیصل کو مقرر کیا۔

شاہ فیصل ایوارڈ عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا گرانقدر ایوارڈ ہے جو ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں پہلی بار دیا گیا اور اس وقت سے اب تک اس ایوارڈ کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک ۱۵۷ افراد کو یہ ایوارڈ دیا جاچکا ہے۔ مختلف حوالوں سے نمایاں کارکردگی پیش کرنے والے حضرات کو اس ایوارڈ کے لئے منتخب ہونے پر تعریفی سند کے ساتھ ساتھ ساڑھے سات لاکھ سعودی ریال کا نقد انعام بھی دیا جاتا ہے۔

طالبانِ علومِ نبوت و علمبردارانِ کتاب و سنت کو یقیناً اس روح پرور خبر سے مسرت و شادمانی حاصل ہوگی کہ سالِ رواں (۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء) کا عالمی شاہ فیصل ایوارڈ برائے "تحقیقاتِ اسلامی و خدماتِ حدیث" ملک شام کے محدثِ نبیل، فقیہ بے مثیل، بقیۃ السلف، یگانہ روزگار علامہ زماں شیخ محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ کو دیا گیا ہے اور اس سال نامزد ہونے والوں کو یہ انعام 'ریاض' میں تقسیم کیا گیا البتہ شیخ البانی حفظہ اللہ نے اپنا قائم مقام شیخ محمد بن ابراہیم شقرہ کو بنا کر بھیجا تھا۔

شیخ البانی حفظہ اللہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں کہ آپ کی زندگی کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہے، علماء کے لئے اُسوہ ہے آپ اپنی دینی خدمات، بے نظیر تصنیفات، مقالات، تحقیقات، تالیفات و تخریجاتِ احادیثِ نبویہ کی وجہ سے عالم اسلام کے گوشے گوشے میں اہل علم کے درمیان خصوصیت سے معروف ہیں۔ آپ کو حدیثِ نبوی، رجال اور اسانید پر عبور حاصل ہے۔ جس انداز سے آپ نے دین اسلام کی بے لوث خدمت انجام دی ہے، وہ قابل شکر و امتنان اور لائق مبارکباد ہے۔ اس وقت علم حدیث میں آپ کا کوئی ہمسر اور ثانی نظر نہیں آتا ہے۔ محدث موصوف سینکڑوں کتابوں کے مصنف و محقق، حسن اخلاق کے پیکر، بزرگ عالم دین، شب زندہ دار انسان ہیں۔ حق گوئی، راست بازی اور بے باکی آپ کا امتیازی وصف ہے۔ حکومت و اشخاص کی خوشامد اور چاپلوسی سے آپ کو سخت نفرت اور چڑ ہے اور اسی

وجہ سے آپ کو اپنے وطن مالوف اور بعض دوسری جگہوں کو احقاقِ حق کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ آپ جہاں جاتے اور قیام کرتے ہیں وہاں کے بعض مخصوص ذہنیت و عقیدے کے حامل افراد آپ سے خوفزدہ اور سہمے رہتے ہیں اور اپنے راستے کا کانٹا تصور کرتے ہیں۔ محاضرات و بیانات اور خطابات و ملاقات اور کیسٹوں پر پابندیاں عائد کرواتے ہیں لیکن اتنی سخت پہرہ داری کے باوجود بھی آپ دعوتی و تبلیغ مشن و کاز کو فروغ دینے میں کوشاں رہتے ہیں اور ہمہ وقت اس دھن میں مگن رہتے ہیں۔ غرضیکہ بڑی خوبیوں کا حامل ہے یہ فرشتہ خصلت انسان۔ ع

کم فرشتوں سے نہیں ہوتے خصائل جن کے ایسے انسان بھی مل جاتے ہیں انسانوں میں

آپ کا وجود ملتِ اسلامیہ کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ عرصہ دراز سے آپ زبان و قلم کے ذریعہ دین اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۴ سال سے متجاوز ہے تاہم اس عالم پیری میں بھی آپ کا قلم دورِ حاضر کے ڈاکٹروں اور مشائخ سے زیادہ زور آور ہے۔ عالم اسلام کے تمام کے تمام علماء کی مسلک و مذہب کے استثناء کے بغیر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ سنن اربعہ کی صحیح و سقیم روایتوں کو الگ کر دیتے تاکہ اہل علم و قارئین حضرات صحیح روایات سے استدلال کرتے۔ اس عظیم کام کا بار بھی آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور باحسن و خوبی انجام دیا۔ ہر ایک کتاب کی صحیح و ضعیف روایتوں کو الگ کر کے کتابی شکل دے کر طباعت کے حوالے کر دیا جو چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ علم حدیث کا کوئی بھی طالب علم خواہ چھوٹا ہو یا بڑا آپ کی علمی کاوشوں اور تحقیق و تخریج سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ کی شخصیت علمی مصدر و مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اے اللہ ان کا سایہ امت مسلمہ پر تادیر قائم و دائم رکھ اور ان کو خدمت حدیث کی مزید توفیق سے بہرہ ور فرما۔ آمین!

مملکتِ سعودی عرب نے آپ کی اسلامی خدمات و کمال علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۹۹ء کا شاہ فیصل ایوارڈ برائے تحقیقاتِ اسلامی آپ کو عنایت کیا ہے، اس حسن انتخاب پر سعودی عرب اور "جائزة الملك فيصل العالمية" کے تمام ذمہ داران مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ البانی کی علمی شخصیت اس ایوارڈ سے کہیں زیادہ بالاتر اور وقیع ہے۔ یہ آپ کی خدمات کا ایک ادنیٰ اعتراف ہے۔ اس ایوارڈ سے آپ کی شخصیت کی علمی وجاہت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ اس ایوارڈ کا اعزاز اور اعتماد دوچند ہوا ہے۔ (بشکریہ ماہنامہ السراج، نیپال)

محدث کی فتنہ انکار حدیث پر خصوصی اشاعت ان دنوں تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ اس موضوع سے محدث کو خصوصی مناسبت ہے چنانچہ اس اشاعت کے لئے بعض بڑے اہم مضامین معروف اہل علم سے تحریر کروائے گئے ہیں۔ مدیر اعلیٰ محدث کی حالیہ دورۂ اُردن میں شیخ البانی سے متعدد ملاقاتیں اور محدث کے لئے بطور خاص ان کا انٹرویو، کویت میں سرگرم فتنہ پرویزیت پر بے لاگ تحقیقی جائزہ، مقامِ حدیث پر جدید اعتراضات کی شافی وضاحتیں وغیرہ اس اشاعت میں شامل ہوں گی۔ جو اہل علم اس میں اپنے علمی مقالات شائع کروانا چاہیں، وہ ہفتہ عشرہ میں ادارہ سے رابطہ کریں۔ جو قارئین زیادہ شمارے لینا چاہیں، یا کوئی اشتہار / اعلان دینا چاہتے ہوں، وہ بھی فوری رابطہ کریں..... (ادارہ)

روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۱۴ جولائی کو شائع شدہ جمعیت علماء پاکستان کے الزام کی مدیر اعلیٰ کی طرف سے تردید

سپریم کورٹ (شریعت اپلیٹ بنچ) کے معاون حافظ عبدالرحمٰن مدنی نے روزنامہ نوائے وقت لاہور (۱۴ر جولائی ۱۹۹۹ء) میں شائع شدہ جمعیت علماءِ پاکستان (نیازی گروپ) کے اس الزام کی پرزور تردید کی ہے کہ وہ موجودہ افراطِ زر کا علاج اشاریہ بندی (انڈیکسیشن) کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ انڈیکسیشن جو سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے پانچ ستونوں میں سے ایک ستون ہے، کی تائید کرنے کا موقف ان سے منسوب کردیا گیا ہے حالانکہ سپریم کورٹ (شریعت اپلیٹ بنچ) کے روبرو اپنی چار روزہ بحث میں انہوں نے بار بار اشاریہ بندی کو ایک ظالمانہ تخمینہ قرار دیا اور بتایا کہ سرمایہ دارانہ نظام سود، ٹیکس، بیمہ، موجودہ بے بنیاد کرنسی اور اشاریہ بندی کی اساس پر قائم ہے جو تمام ظالمانہ طریق کار ہیں اس لئے ضروری ہے کہ سود (ربا) کو ختم کرکے ملکی معیشت کی گاڑی کو اسلامی نظام کی طرف دھکیلا جائے۔ سپریم کورٹ میں اپنی بحث کے دوران انہوں نے ان لوگوں کی بھی تردید کی تھی جو افراطِ زر کی واقعاتی خوفناک صورتحال کا علاج سود یا شرحِ سود میں اضافہ سے تجویز کرتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں انہوں نے عدالتِ عظمیٰ میں متعدد ایسے نکات بھی پیش کیے تھے کہ اگر افراطِ زر کے لئے اشاریہ بندی کا مفروضہ حل تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر بھی سود کے متعین یا مشروط اضافہ کا جواز نہیں نکل سکتا کیونکہ سودی اضافہ اور انڈیکسیشن کا نام نہاد توازن بالکل دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود اشاریہ بندی (انڈیکسیشن) کے موقف کو مدنی صاحب کی طرف منسوب کرنا زیادتی ہے۔

دوسرے اعتراض کے بارے میں بھی مدنی صاحب نے وضاحت کی کہ سود کی تمام اقسام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں ہر شکل کی مکمل حرمت کا مسئلہ نہ صرف فقہی مسئلہ ہے بلکہ اس کا تعلق مسلمہ اسلامی عقیدہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں اسلامی شریعت کی تمام جزئیات مسئلہ سود سمیت اس طرح نمایاں کرگئے تھے جس طرح دن رات سے روشن ہوتا ہے۔ انہوں نے اس عقیدہ کی وضاحت قرآن وحدیث دونوں طرح کے دلائل سے کی تھی اور تحریری اور زبانی بحث میں یہ بھی اجاگر کیا تھا کہ اجتہاد بھی کتاب وسنت سے کوئی خارجی شے نہیں بلکہ اجتہاد کے ذریعے کتاب وسنت ہی کے مخفی گوشوں اور وسعتوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ بحث منکرین حدیث کے حضرت عمرؓ کے ایک قول کے بارے میں شبہ کی بنا پر شروع ہوئی تھی جس کا جواب یہ دیا گیا تھا کہ سود کی بعض شکلیں عہد نبوت کے آخر میں حرام ہونے کی بنا پر نئے پیش آمدہ مسائل کے سلسلہ میں بعض صحابہ بے چینی کا شکار ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "سود (ربا) بھی چھوڑو اور مشکوک صورتیں (ریبہ) بھی چھوڑو۔" مدنی صاحب نے اپنی بحث کے شروع میں اور آخر میں دوبارہ یہ واضح کردیا تھا کہ اگرچہ اس قول کی روایت اعلیٰ درجہ کی نہیں تاہم اس سے انکار کے بجائے اس کی ایسی توجیہ زیادہ مناسب ہے جبکہ سود کی حرمت کے بارے میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ سود سابقہ شریعت بنی اسرائیل میں بھی حرام ہونے کی بنا پر ابتدائے نبوت ہی سے حرام تھا تاہم اس کی بعض نئی صورتیں تدریج سے حرام ہوتی رہیں جن میں سود مرکب وغیرہ کو غزوۂ احد سے بھی قبل حرام کردیا گیا تھا، البتہ تجارتی سود مفرد میں حضرت عباس وغیرہ بعض صحابہ کے حجۃ الوداع تک ملوث رہنے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سود کی بعض اقسام آخر عہد نبوتؐ میں حرام ہوئیں لیکن اس تدریج کو مان لینے کے باوجود اب کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم مکمل شریعت ہی کے ذمہ دار ہیں۔

مولانا مدنی نے کہا کہ روزنامہ نوائے وقت کے ایک رپورٹر کی غلط فہمی کا ازالہ خود مولانا مدنی نے اپنے ایک بیان جو روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۰ر مئی ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۱۰ پر شائع ہوچکا ہے کردیا تھا۔ مزید تفصیلات ماہنامہ محدث لاہور شمارہ جون ۱۹۹۹ء میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل نشر ہوچکی ہیں۔ (نوائے وقت ۱۵ر جولائی صفحہ آخر پر چھپی)